شعبان المعظم ۱۴۴۲ھ

اپریل ۲۰۲۱ء

ماہنامہ میثاق (لاہور)

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

قرآن حکیم کے حقوق

اور اس کے عملی تقاضے

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

رمضان المبارک میں طبع جدید پیش خدمت ہے

سات حصوں کے بجائے اب چار جلدوں میں

- خوبصورت قرآنی رسم الخط
- حتی الامکان اغلاط سے مبرّا
- عمدہ سفید کاغذ
- معیاری طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل
- مضبوط ریگزین جلد
- متعدد ظاہری و معنوی خوبیوں کا مرقع
- بڑے سائز کے 2560 صفحات

قیمت (مکمل سیٹ) 4800/- روپے

رمضان المبارک میں خصوصی رعایتی پیکج کا اعلان کیا جائے گا!

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَمِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	70
شمارہ	:	4
شعبان المعظّم		1442ھ
اپریل		2021ء
فی شمارہ	:	40 روپے

(اس شمارے کی قیمت: 80 روپے)

سالانہ زرِتعاون: 400 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلسِ ادارت:
ایوب بیگ مرزا' خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی مُعاونین:
حافظ محمد زاہد' محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن' لاہور 54700 ' فون: 3-35869501
فیکس: 35834000' ای میل: maktaba@tanzeem.org
ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
رابطہ برائے ادارتی امور: 38939321(042)
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال		5
مشتری ہوشیار باش!	ایوب بیگ مرزا	
دعوت رجوع الی القرآن		9
قرآن حکیم کے حقوق اور اس کے عملی تقاضے	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
بیانُ القُرآن		41
سورۃ الطُّور (مکمل)	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
دعوت وتحریک		57
انجمن کے بعد تنظیم کیوں؟	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	
افکار وآراء		63
عہدِ حاضر کی ریاست 'اسرائیل' کو تسلیم کرنے کا مسئلہ	انجینئر مختار حسین فاروقی	
جادہ ومنزل		73
مقامِ محمود اور غلبہ وا قامتِ دین.......	انجینئر محمد رشید عمر	
راہِ عمل		87
اتحادِ اُمت اور اقامتِ دین	عبدالرؤف	
اقبالیات		95
اقبال اور نظامِ تعلیم	پروفیسر نجیب الحق	
عکسِ سیرت		107
پیغام اور کردار کی طاقت	صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی	
نجومِ ہدایت		112
حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ	احمد علی محمودی	
آمد بہار کی ہے		117
رمضان اور معاشرتی ماحول	مسز بینا حسین خالدی	
حسنِ معاشرت		121
خوشگوار ازدواجی زندگی: راہنما اصول	مولانا عبدالمتین	
آدابِ معاشرت		129
کھانے پینے کے آداب	حافظ محمد زاہد	
دعوتِ فکر		137
مسلم سائنس دان: موساد کا خصوصی ہدف	رضی الدین سیّد	
علومِ قرآنی		143
علم تفسیر اور مفسّرین کرام	پروفیسر حافظ محمد قاسم رضوان	
انوارِ ہدایت		158
السلام علیکم	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	

مشتری ہشیار باش!

پاک بھارت مذاکرات کا ڈول ایک بار پھر ڈالا جا رہا ہے اور اس مرتبہ متحدہ عرب امارات کے ناتواں کندھوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کی گزشتہ چند ہفتوں سے زوردار انداز میں سرگرمیاں جاری تھیں۔ یہ بریکنگ نیوز امریکی جریدے بلومبرگ نے دی‘ دیگر ویب سائٹس اور اخبارات نے اضافی تفصیلات فراہم کیں۔ تفصیلات کے مطابق سعودی عرب نے بھی اِس میں اہم رول ادا کیا۔ اِس سال ۲۵ فروری کو ۲۰۰۳ء میں طے پانے والے جنگ بندی کے معاہدے کے احیاء کا اعلان ہوا تو وہ ان ہی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ یو اے ای کے وزیر خارجہ اور سعودی عرب کے نائب وزیر خارجہ نے اِس حوالے سے مختلف اوقات میں بھارت کے دورے کیے۔ پاکستان سے خاص طور پر عسکری قیادت سے اِن دونوں ممالک کی قیادت مسلسل رابطے میں رہی اور بالآخر یہ طے پایا کہ پاک بھارت سفارتی تعلقات مکمل طور پر بحال کیے جائیں‘ تجارت‘ پانی کی تقسیم اور مسئلہ کشمیر پر بات کی جائے۔

ہمیں اِن مذاکرات پر کوئی اعتراض نہیں‘ اِس لیے کہ جدید تاریخ بتاتی ہے کہ جنگ نے مسائل پیدا کیے ہیں‘ حل نہیں کیے۔ خاص طور پر جب ایٹمی صلاحیت کے حامل دو ممالک میں کوئی تنازعہ ہوگا تو مذاکرات کے سوا کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ بھارت جو ایک عرصہ سے مذاکراتی عمل کو بُری طرح دھتکار رہا تھا اور نفرت انگیز طریقے سے پاکستان سے بات کرنے سے انکار کرتا تھا‘ وہ یکلخت مذاکرات کے لیے تیار کیوں ہوگیا؟ اور شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ مذاکرات کی خواہش کا اظہار بھارت کی طرف سے ہوا۔ اِس لیے کہ گزشتہ چند ماہ سے بھارت‘ یو اے ای اور سعودی عرب کی سیاسی اور عسکری قیادت کے مابین بڑی آمدورفت دیکھنے میں آئی تھی۔ ہم کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے پاک بھارت مذکرات کی تاریخ کا جائزہ لیں گے‘ کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ حال اور مستقبل کے حوالے سے فیصلے کرنے سے پہلے یا رائے کا اظہار کرنے سے پہلے ماضی میں جھانکنا ایک ناگزیر ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مذاکرات کے

حوالے سے بھارت نے جب بھی عالمی اداروں کا رُخ کیا یا کسی دوسرے ملک کو بیچ میں ڈالا تو وہ ایسا وقت ہوتا تھا جب بھارت اندرونی یا بیرونی سطح پر بُری طرح پھنس جاتا تھا‘ اور وہ اِن مذاکرات کو time buy کرنے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب قبائلی مجاہدین نے کشمیر میں آگے بڑھنے کا سلسلہ شروع کیا اور وہ جموں کے ہوائی اڈے کے قریب پہنچ چکے تھے تو پنڈت نہرو بھاگ کر اقوامِ متحدہ پہنچ گئے اور سلامتی کونسل کی وہ تاریخی قرارداد منظور ہوگئی جس کے مطابق کشمیریوں کو استصوابِ رائے کا حق دینا طے ہوا تھا۔ پاکستان نے کشمیر میں سیز فائر کو قبول کرلیا‘ مجاہدین کے قدم روک دیے گئے۔ حالات کچھ نارمل ہوئے تو بھارت نے پینترا بدل لیا۔ آج تک وہ قرارداد سلامتی کونسل کے سردخانے میں پڑی ہے‘ بلکہ اب تو ردّی کی ٹوکری کی نذر ہو چکی ہے۔ بھارت نے منحرف ہونے کا جو جواز گھڑا وہ اِس قدر بھونڈا تھا کہ سن کر انسانی ضمیر کو کراہت محسوس ہوتی ہے۔ بھارت نے یہ مضحکہ خیز موقف اختیار کیا کہ چونکہ پاکستان سیٹو اور سینٹو معاہدے کا رکن بن گیا ہے‘ لہٰذا اب کشمیریوں کو استصوابِ رائے کا حق نہیں دیا جا سکتا۔

۱۹۶۲ء میں ہند چینی سرحدی جھڑپیں ہوئیں‘ بھارت نے مقبوضہ کشمیر سے فوج نکال کر چینی سرحد پر بھیج دی۔ مقبوضہ کشمیر خالی پڑا تھا۔ پاکستان کو کشمیر میں واک اوور مل سکتا تھا۔ لیکن امریکہ کے ذریعے پاکستان کے فوجی صدر کو جنگ کے بعد کشمیر پر مذاکرات کی لوری دی گئی اور وردی پوش صدر میٹھی نیند سو گیا۔ بھارت ایک مرتبہ پھر مذاکرات کا جھانسہ دے کر مشکل وقت سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان مقبوضہ کشمیر میں آگے بڑھا تھا۔ بھارت نے بین الاقوامی سرحد پر حملہ کر کے پاکستان کی یہ پیش قدمی روک دی۔ لیکن پاکستان اپنا دفاع کرنے میں مکمل طور پر نہ صرف کامیاب رہا بلکہ مقبوضہ کشمیر کی کچھ چوکیاں اور کچھ بھارتی علاقے پاکستان کے قبضہ میں آ گئے۔ بھارت جنگ جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہ رہا۔ اس مرتبہ سوویت یونین کا سہارا لیا گیا۔ تاشقند میں مذاکرات ہوئے۔ پاکستان نے جو تھوڑا بہت جنگ میں جیتا تھا وہ تاشقند کے کانفرنس روم میں کھو دیا۔ طے ہوا کہ پاکستان اور بھارت مسئلہ کشمیر پر وزارتِ خارجہ کی سطح پر مذاکرات کریں گے۔ بھارت کا کام نکل چکا تھا‘ اُس کی بدنیتی پھر سامنے آئی۔ مذاکرات کے لیے وزیر خارجہ کی بجائے وزیر ریلوے سورن سنگھ کو آگے کر دیا۔ مذاکرات کے انتہائی بے سود قسم کے سات راؤنڈ ہوئے‘ جو ناکامی سے دوچار ہو کر اختتام پذیر ہوئے اور پاکستان مُنہ دیکھتا رہ گیا۔

بھارت نے کبھی ایسے حالات میں مذاکرات کا نام نہیں لینے دیا جب پاکستان کسی مشکل سے دوچار ہو۔ کارگل کے محاذ پر جب امریکی مواصلاتی نظام کی وجہ سے پاکستان کی کامیابیاں ناکامیوں اور شکست میں تبدیل ہونے لگیں تو پاکستان کی درخواست پر امریکہ نے دونوں ممالک کو مذاکرات کا کہا۔ پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف امریکہ پہنچ گئے‘ لیکن بھارت کے وزیراعظم نے امریکہ جانا تک گوارا نہ کیا۔ لہٰذا دوطرفہ مذاکرات کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا۔

آج اگر بھارت مذاکرات کے لیے زور زور سے اثبات میں سر ہلا رہا ہے تو اُس کی کئی وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم ترین وجہ یہ ہے کہ لداخ کے محاذ پر چین کے ہاتھوں اُسے جو بدترین ہزیمت اُٹھانا پڑی ہے اور وہ اپنی سرزمین گنوا بیٹھا ہے‘ اِس شکست نے اُس کا ناک زمین سے لگا دیا ہے۔ دوسری وجہ پہلی ہی کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ پاکستان نے ظاہر کر دیا تھا کہ چین کے ساتھ مکمل جنگ کی صورت میں پاکستان بھی بھارت کو نہیں بخشے گا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ پنجاب کے کسانوں کے احتجاج نے اور Covid-19 نے بھارت کی معیشت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ مودی کو اب اگلے انتخابات میں خطرات کا سامنا ہے۔ لہٰذا امن کی طرف پیش رفت معیشت کی بحالی اور اپنی سیاسی صورتِ حال کو بہتر کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اور Last but not the Least یہ کہ مودی کی خارجہ پالیسی نے بھارت کو امریکہ کی گود میں ڈال دیا ہے۔ امریکہ کو افغانستان کے حوالے سے پاکستان کے تعاون کی ضرورت ہے۔ یہ تعاون پاک بھارت کشیدگی ختم کیے بغیر نہیں مل سکتا۔ یہاں موضوع سے ہٹ کر عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ جو بائیڈن افغانستان کا مسئلہ جس طرح حل کرنا چاہتا ہے اور اِس سے جو نتائج حاصل کرنا چاہتا ہے‘ امریکہ کے کچھ سابق صدور یہ سب کچھ آزما کر ناکام ہو چکے ہیں۔ امریکہ چاہتا ہے کہ پاکستان اور بھارت باہمی تعلقات نارمل کر کے چین کے محاصرے میں امریکہ کا ساتھ دیں۔ افغانستان میں بھی ایسی حکومت ہو جو امریکی مفاد کے خلاف کسی بھی سرگرمی یا عمل کو روکنے میں مستعد ہو۔

ہم پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ اسرائیل‘ امریکہ اور بھارت فطری اتحادی ہیں۔ اسلام دشمنی اِن کی مشترکہ صفت ہے۔ اگر پاکستان نے بھارت سے تعلقات بہتر کرنے کی خاطر یا کشمیر کے حوالے سے بھارت سے کوئی favour حاصل کرنے کے لیے افغانستان میں اپنا وزن افغان طالبان کے مخالف پلڑے میں ڈالا یا افغان طالبان کے

خلاف امریکی ایکشن کی کسی بھی قسم کی مدد کی تو وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔ مذکورہ بالا ابلیسی اتحاد کبھی اسلام اور پاکستان کا دوست نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا مذاکرات کریں‘ گفت و شنید کریں‘ لیکن یہ ہرگز فراموش نہ کریں کہ بھارت نے ہمیشہ بچھو کا کردار اپنایا ہے اور موقع ملنے پر ڈنگ مارا ہے۔ جبکہ اسرائیل پاکستان کو ’’گریٹر اسرائیل‘‘ کے راستے کی رکاوٹ سمجھتا ہے‘ اور امریکہ دونوں کا پشتیبان ہے۔ لہٰذا مشتری ہشیار باش! سفارتی تعلقات بحال کر لیں‘ تجارت بھی شروع کر دیں‘ لیکن یاد رکھیں بھارت کبھی مذاکرات کے ذریعے کشمیر سے دستبردار نہیں ہوگا۔ وہ کشمیر پر مذاکرات صرف وقت گزارنے کے لیے کرے گا۔ ایک سوال بڑا اہم ہے۔ بھارت کو جب بھی کوئی مشکل آن پڑے اور وہ پاکستان سے مذاکرات کی حامی بھرتا ہے تو ایجنڈے میں مسئلہ کشمیر کو سب سے آخر میں کیوں رکھتا ہے؟ ہماری نظر میں سیدھی سی بات ہے کہ اگر کشمیر کو ایجنڈے میں سرفہرست رکھا جائے اور اس کا کوئی حل نکل آئے تب دوسرے مسائل تو خود بخود ہی حل ہو جائیں گے۔ تجارت شروع ہو جائے گی۔ آمدورفت تو روکے نہیں رُکے گی۔ تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے تو جنگ کے خطرات دفن ہی ہو جائیں گے۔ اور ہمیں چاہیے ہی کیا؟ گویا اصل مسئلہ ایک ہی ہے‘ باقی مسائل اُسی کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ یعنی مسئلہ کشمیر حل ہو جائے تو دوسرے پاک بھارت مسائل اور تنازعات خود بخود حل ہو جائیں گے۔

ہم نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ دو ایٹمی ممالک کے درمیان جنگ کا تصوّر بھی خوفناک ہے۔ لہٰذا مذاکرات ہی مناسب اور موزوں راستہ ہے۔ لیکن اگر ہم نے مذاکرات کے دوران (کسی بھی مرحلہ پر) اُمّتِ مُسلمہ کی واحد ایٹمی قوت ہونے کی اپنی حیثیت کو بھلا دیا اور اپنے وقتی یا عارضی فائدے کے لیے غنیم کے جھوٹے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اپنے افغان طالبان بھائیوں کے خلاف امریکہ کا کسی بھی طرح کا ساتھ دینے کا سوچا تو پھر اِس قرآنی حکم ’’اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دلی دوست (حمایتی اور پشت پناہ) نہ بناؤ‘‘ (المائدۃ: ۵۱) کی مخالفت کی پاداش میں ہمیں دنیا و آخرت کا خسارا بھگتنا ہوگا۔ انڈیا ہمیشہ کی طرح مذاکرات سے بھاگ نکلے گا اور امریکہ کا ’’ساتواں بیڑا‘‘ کا وعدہ ایک بار پھر ہمارا بیڑا غرق کر دے گا اور آخرت میں بھی ہمیں جواب دینا پڑے گا۔ لہٰذا ہمیں اقبال کا یہ پیغام یاد رکھنا ہوگا ؎

اپنی مِلّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر!
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ!!

❀❀❀

قرآن حکیم کے حقوق
اور اس کے عملی تقاضے

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ نے رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ (مئی۔ جون ۱۹۸۶ء) میں ناظم آباد بلاک نمبر ۵ کراچی کی جامع مسجد میں دورۂ ترجمہ قرآن کی ذمہ داری انجام دی۔ اسی مسجد میں ۱۶ مئی ۱۹۸۶ء کو رمضان المبارک کا پہلا خطاب جمعہ ''قرآن حکیم کے حقوق اور اس کے عملی تقاضے'' کے موضوع پر ارشاد فرمایا۔ شیخ جمیل الرحمٰن مرحوم نے اس خطاب کو ترتیب وتسوید کے بعد میثاق کی خصوصی اشاعت بموقع رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ (مئی ۱۹۸۸ء) میں شائع کر دیا۔ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ کی آمد پر یہ خطاب مزید نظر ثانی کے بعد ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

الحمد للہ وکفٰی والصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی خُصُوْصًا عَلٰی خاتم النبیین محمدٍ الامین وعلٰی آلہ وصحبہ اجمعین ۔ امَّا بعد:

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾﴾ (البقرۃ)

وقال النبی ﷺ: ((يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَافْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ)) (شعب الایمان)

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ
اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَهُدًى وَّرَحْمَةً
اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّيْلِ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ (آمین!)

معزز حاضرین! اگرچہ میرا یہ خیال تھا کہ میں آج عظمتِ قرآن کے موضوع پر گفتگو کروں‘ لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ مضمون زیادہ تر علمی نوعیت کا ہے‘ جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہدایات وتعلیماتِ قرآنیہ کے کچھ عملی پہلو ہمارے سامنے آئیں۔ اگر علم میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور عمل میں ترقی نہ ہو تو یہ مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے دین کا مزاج یہ ہے ----- اور یہ مزاج صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بہت نمایاں تھا ---- کہ وہ علمی نکات کی طرف زیادہ نہیں جاتے تھے بلکہ قرآن مجید کے عملی پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرتے تھے۔ چنانچہ آپ کے علم میں ہو گا کہ ہمیں اس بات سے روکا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے بارے میں بحث کریں‘ بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے انعامات واحسانات پر زیادہ غور کیا کرو۔ اللہ کی ذات پر غور کرو گے اور اس کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش کرو گے تو فتنہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ کمال پر اجمالی ایمان زیادہ مفید ہے۔ مثال کے طور پر اللہ سمیع وبصیر ہے‘ وہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی۔ لیکن کیسے سنتا ہے اور کیسے دیکھتا ہے؟ جہاں اس چکر میں پڑے گمراہ ہو جاؤ گے۔ اللہ الحی ہے‘ وہ زندہ ہے‘ لیکن اُس کی حیات اور زندگی کیسی ہے؟ جہاں اس کو معین کرنے کی کوشش کرو گے گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ صحیح اور محتاط طرزِ عمل اور رویہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو۔ اُس کی آیاتِ آفاقی وانفسی پر تفکر وتدبر کرو اور اس سے آگے بڑھ کر اُس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرو۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ روش صحیح نہیں ہے کہ حضور ﷺ کی عظمت کو تو زیادہ شدومد کے ساتھ بیان کیا جاتا رہے اور آپ ﷺ جو مشن لے کر تشریف لائے تھے اس پر

ہماری توجہ کم رہے۔ آپ ﷺ کی حقیقی عظمت تو ہمارے وہم وخیال سے بھی بالاتر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم اس پر زیادہ قوتِ لسانی صرف کریں تو کہیں نہ کہیں توہین کے مرتکب ہوجائیں۔ اس لیے کہ کسی کی عظمت بلند تر ہو اور ہم اسے کم تر بیان کریں تو یہ گویا ایک نوع کی توہین ہے اور ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حقیقی عظمت جس قدر اعلیٰ وارفع ہے وہ ہمارے تخیل و توہّم سے ماوراء ہے۔ اس میں محنت کریں گے اور قوتِ بیان صرف کریں گے تو ہوسکتا ہے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اصل طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ سوچا جائے کہ نبی اکرم ﷺ سے ہماری نسبت اور تعلق درست ہے یا نہیں! حضور ﷺ کے دامن سے صحیح وابستگی ہے یا نہیں! حضور ﷺ کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور ہم انہیں کس حد تک ادا کر رہے ہیں! آج (۱۹۸۶ء) سے لگ بھگ چودہ سال قبل میں نے اسی مسجد میں ''نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی بنیادیں'' کے موضوع پر ایک تقریر کی تھی' جسے بعدازاں کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ اس کتابچے کا موضوع یہی ہے کہ ہماری نجاتِ اُخروی کا دارومدار اصلاً اس بات پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں درست ہوں اور حضور ﷺ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح ہو۔

یہی معاملہ قرآن مجید کا ہے۔ قرآن مجید کی عظمت کا موضوع بھی یقیناً بہت اہم ہے۔ خود قرآن مجید میں قرآن کی عظمت کا بیان مختلف اسالیب اور مختلف پیراؤں میں آیا ہے۔ کہیں تمثیل کے پیرائے میں فرمایا: ﴿لَوۡ اَنۡزَلۡنَا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیۡتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡیَۃِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ (پہاڑ) دب جاتا' پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے''۔ ﴿وَتِلۡکَ الۡاَمۡثَالُ نَضۡرِبُہَا لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الحشر) ''اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور وفکر سے کام لیں'' ـــــ قرآن کی عظمت کا صحیح ادراک تمہارے لیے ممکن نہیں ہے' کوئی تصور کر سکتے ہو تو اس مثال سے کرو۔ قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اس کلام پاک کی مدح فرمائی ہے۔ جیسے سورۂ یونس میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۬ۙ وَہُدًی وَّرَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾ قُلۡ بِفَضۡلِ اللّٰہِ وَبِرَحۡمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلۡیَفۡرَحُوۡا ؕ ہُوَ خَیۡرٌ مِّمَّا یَجۡمَعُوۡنَ ﴿۵۸﴾﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس آ گئی ہے نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور (تمہارے) سینوں میں جو روگ ہیں ان کی شفا اور ہدایت و رحمت اہلِ ایمان کے حق میں۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت کا مظہرِ اتم ہے' پس اس (انعام و احسان) پر خوشیاں مناؤ (کہ اللہ نے قرآن جیسی نعمت تمہیں عنایت فرمائی)۔ جو چیزیں لوگ جمع کرنے (کی کوشش اور فکر) میں لگے رہتے ہیں یہ (قرآن) ان سے کہیں زیادہ قیمتی شے ہے۔''

اس کے علاوہ متعدد مقامات پر یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ میں تمہیداً عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت مجھے 'عظمتِ قرآن' کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنی۔ میں نے آغاز میں سورۃ البقرۃ کی جو آیت مبارکہ تلاوت کی ہے اس میں ماہِ رمضان کا اور روزے کی فرضیت کا ذکر ہے' اس قرآن کے ھُدًی لِّلنَّاسِ اور بینہ ہونے کا ذکر ہے' اور حق و باطل اور صحیح و غلط میں فرق وتمیز کرنے والی کتاب ہونے کا ذکر ہے۔ پھر اس آیت مبارکہ کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوا ہے: ﴿وَلَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ اس دو لفظی حصّہ میں نزولِ قرآن کا مقصد اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ ''اور تاکہ تم (اس لازوال نعمت پر) اللہ کا شکر ادا کرو''۔ قرآن کا شکر کیا ہے؟ یہ کہ ہم قرآن کی ہدایات' تعلیمات' احکام' اوامر و نواہی کی پیروی کریں اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو ان تمام چیزوں کا پابند بنائیں اور اس پر عمل پیرا ہوں اور اس طرح قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی فکر کریں۔ مجھے آج اسی کے ضمن میں گفتگو کرنی ہے۔

یہ بات بھی جان لیجیے کہ آپ جو روزہ رکھ رہے ہیں' یہ بھی آپ قرآن کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۵ کے آغاز میں فرمایا: ﴿شَہۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡاٰنُ﴾ پھر قرآن کا تعارف ان الفاظ مبارکہ سے کرا دیا گیا کہ یہ ﴿ہُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡہُدٰی وَالۡفُرۡقَانِ ۚ﴾ ہے۔ پھر حکم دیا گیا کہ ﴿فَمَنۡ شَہِدَ مِنۡکُمُ الشَّہۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ ؕ﴾

قرآن کن لوگوں کے لیے ہدایت ہے؟

اس مقام پر قرآن مجید کو 'ھُدًی لِّلنَّاس'' فرمایا گیا ہے کہ یہ ہدایت ہے پوری نوعِ بشر کے لیے' جبکہ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں قرآن کو 'ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ'' قرار دیا گیا ہے کہ یہ ہدایت ہے خدا ترس لوگوں کے لیے۔ جن میں تقویٰ ہی نہیں' خدا کا خوف ہی نہیں وہ اس کتابِ مبین سے

کیا استفادہ کریں گے؟ چنانچہ اس سے ابوجہل‘ ابولہب اور ولید بن مغیرہ استفادہ نہیں کر سکے‘ جبکہ قرآن اُن کی اپنی زبان میں نازل ہو رہا تھا اور اُس ہستی (ﷺ) پر نازل ہو رہا تھا جس کی بے داغ سیرت و کردار ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ جسے یہ خود الصادق اور الامین (ﷺ) قرار دے چکے تھے‘ لیکن پھر بھی محروم کے محروم رہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

حسنؓ ز بصرہ‘ بلالؓ از حبش‘ صہیبؓ از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست!

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جن میں خود میلان اور رجحان نہیں ہے اور جن کے دلوں میں راہِ حق کی جستجو اور طلب نہیں ہے‘ وہ اس ’هُدًى لِّلنَّاسِ‘ سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کتاب سے استفادہ کے لیے تقویٰ‘ خدا ترسی اور راہِ حق کی طلب کی کوئی نہ کوئی رمق ہونی ضروری ہے۔

اب اس بات کو الجبرا کے فارمولے کی طرح ذہن میں جما لیجیے کہ قرآن اصل میں تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ہے‘ لیکن اس سے استفادہ کی شرط تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے کہ اس ماہِ مبارک میں روزہ رکھو جس میں قرآن نازل فرمایا گیا۔ اس ماہ کی برکات سے صحیح طور پر مستفیض ہونے کے لیے دن میں روزہ رکھو۔ اور اس روزے کے ذریعہ سے تقویٰ کی کوئی رمق حاصل ہوئی ہے تو رات کو اللہ کے حضور اس پونجی کو لے کر کھڑے ہو جاؤ کہ اس پر کلامِ الٰہی کی بارش برسے۔ گویا زمین تیار کر لی گئی ہے اور تیار زمین پر بارش برسے تو اس بارش کا فائدہ ہے۔ اگر زمین پر ہل نہیں چلایا‘ بیج نہیں ڈالا تو بارش آئی اور گئی‘ اس زمین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم نے اس روزہ کے ذریعے سے اپنے دل کی زمین کو کچھ تیار کیا ہے‘ اس میں تقویٰ کی کچھ رمق پیدا کی ہے تو اب قیام اللیل کا اہتمام والتزام کرو‘ تا کہ بارانِ رحمت کا نزول ہو‘ یعنی کلامِ الٰہی تمہارے قلب پر نازل ہو۔ بقول علامہ اقبال ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

جب قرآن انسان کے قلب پر اُترتا ہے تو درحقیقت یہ دل میں جذب ہوتا ہے۔ جس دل میں تقویٰ کا ہل چل چکا ہو تو قرآن اس میں بہار لے آتا ہے۔ اس آیت میں آگے کچھ رعایتیں دی گئی

ہیں کہ بیمار ہو یا سفر میں ہو تو تعداد دوسرے دنوں میں پوری کر لو۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے‘ سختی نہیں چاہتا۔

شکر کا مفہوم

آگے ارشاد ہوا: ﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ’’اور اللہ نے جو ہدایت تمہیں عطا کی ہے اس پر اللہ کی تکبیر کرو‘‘۔ ﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ’’اور تاکہ تم شکر کر سکو‘‘۔ میں ’’لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ‘‘ کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں سمجھنا ہے کہ ’’شکر‘‘ کیا ہے! اگرچہ ہم یہ لفظ بولتے ہیں اور یہ اردو زبان میں عام مستعمل ہے۔ اور لفظ شکریہ تو ہماری زبان پر بار بار آتا ہے۔ مہذب انسان کی تو یہ عادتِ ثانیہ ہوتی ہے کہ وہ ہر مہربانی پر شکریہ ادا کرتا ہے‘ لہٰذا تہذیبی و تمدنی زندگی میں یہ ’’شکریہ‘‘ بہت اہم ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری طرح سمجھا جائے کہ ’’شکر‘‘ درحقیقت کسے کہتے ہیں؟ امام راغب اصفہانیؒ نے اپنی عظیم تصنیف ’’مفردات القرآن‘‘ میں قرآن میں استعمال ہونے والے ایک ایک لفظ کے اصل مادہ (root) اور اصل مفہوم پر بحث کی ہے۔ لفظ ’’شکر‘‘ پر ان کی بحث بڑی پیاری ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ شکر کے تین درجے ہیں۔ پہلا ہے ’’شکر بالقلب‘‘ یعنی پہلے کسی کے احسان کا احساس اور شعور تو ہو۔ اس احسان‘ انعام اور نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ تو ہو۔ کسی نے آپ کے ہاتھ پر ہیرا رکھا اور آپ نے اسے محض کانچ کا ایک ٹکڑا سمجھا تو آپ اس کا کیا شکریہ ادا کریں گے؟ آپ کو اس ہیرے کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہیں ہے۔ لہٰذا نعمت کا شکر بقدرِ معرفتِ نعمت ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ کسی نعمت کی قدر و قیمت کا جتنا ادراک و شعور ہوگا‘ اتنا ہی آپ اس نعمت کا شکر ادا کر سکیں گے۔ لہٰذا شکر کا پہلا درجہ اور مرحلہ شکر بالقلب ہے۔ دوسرا درجہ اور مرحلہ ہے ’’شکر باللسان‘‘ — یعنی دل میں جو جذباتِ شکر اُبھرے ہیں‘ اب وہ زبان پر آئیں گے‘ الفاظ کا جامہ اختیار کریں گے اور آپ اپنے محسن و منعم کا زبان سے شکریہ ادا کریں گے۔ اور شکر کا تیسرا درجہ اور مرحلہ ہے ’’شکر بالجوارح‘‘ — یعنی اپنے پورے وجود سے شکر کرنا۔

یہ شکر کیا ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ’’شکر‘‘ دراصل یہ ہے کہ اس نعمت کا حق ادا کیا جائے۔ اگر نعمت کا حق ادا نہیں کیا تو یہ بھی ناشکری ہے۔ میں اس کی تفہیم کے لیے سادہ ترین مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی بچے کو اُس کے والد کوئی اعلیٰ کتاب لا کر تحفے میں دیتے ہیں۔ وہ بچہ

مہذب ہے‘ کلچرڈ ہے‘ وہ فوراً "Thanks daddy" تو کہہ دیتا ہے۔ اس تحفہ پر اباجان کا زبان سے توشکریہ ادا کرتا ہے‘ لیکن پھر اس کتاب کو الماری میں رکھ دیتا ہے‘ کھولتا نہیں‘ اس کا مطالعہ نہیں کرتا۔ تو بتایئے کہ کیا اُس نے شکر کیا؟ حقیقت میں اُس نے ناقدری اور ناشکری کی‘ کفرانِ نعمت کیا۔ باپ نے کتاب اس لیے لا کر دی تھی کہ بچہ پڑھے تو اس کے علم وفہم میں وسعت اور معلومات میں اضافہ ہو‘ لیکن اس بچے نے کتاب سے یہی مقصد حاصل نہیں کیا۔ زبان سے توشکریہ ادا کر دیا‘ حقیقت میں اپنے وجود سے شکریہ ادا نہیں کیا۔ گویا نعمت کا حق ادا کرنا آخری درجہ کا شکر ہے۔

اب اس کے حوالے سے سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن جیسی کتاب دی — اب دیکھئے میں نے ابھی جو مثال دی ہے اس سے بڑی پیاری مناسبت پیدا ہو گئی۔ جیسے باپ نے بچے کو کتاب لا کر دی‘ ایسے ہی ہمارے آسمانی باپ نے ہمارے لیے کتاب اتاری — ’’آسمانی باپ‘‘ کا لفظ انجیل میں آتا ہے اور اس اعتبار سے غلط نہیں ہے کہ جیسے باپ اولاد کی پرورش کرتا ہے‘ ویسے ہی اللہ تعالیٰ آسمانی باپ ہے‘ ربّ العالمین ہے‘ تمام جہانوں کا پروردگار اور پالن ہار ہے — تو ہمارے پروردگار نے ہمیں کتاب دی اس لیے کہ ہم اس سے ہدایت اخذ کریں‘ اسے ہم اپنا امام اور راہنما بنائیں‘ اس سے اپنے سینوں کو آباد کریں‘ اس سے ہم اپنے قلوب و اذہان کو روشن کریں‘ اس کی تعلیمات سے استفادہ کریں۔ اس کتاب سے اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کریں‘ اُس کی صفاتِ کمال کا ادراک کریں‘ اُس کی توحید کو پہچانیں‘ اُس کی مرضیات کا شعور وفہم حاصل کریں‘ اُس کے اوامر ونواہی سے آگاہ ہوں اور اس پوری کائنات بالخصوص انسان کی تخلیق کے مقصد کو جانیں — لیکن اگر ہم نے اس کتاب کو بند کر کے رکھ چھوڑا اور اسے گاہے بگاہے چوم لیا‘ یا یہ اگر کہیں ہاتھ سے گر گیا تو اس کے ہم وزن گندم صدقہ کر دی‘ یا بچی کو اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ نسخہ جہیز میں دے دیا‘ یا یہ کہ بہو جب پہلی بار گھر میں داخل ہو رہی ہے تو اس پر قرآن کا سایہ کر لیا — تو کیا قرآن کے یہ حقوق ہیں؟ کیا قرآن ہمیں ان کاموں کے لیے دیا گیا تھا؟

دعوت رجوع الی القرآن کا آغاز

میں نے لاہور میں ۱۹۶۶ء کے اواخر میں اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت کے بھروسے پر دعوت رجوع الی القرآن کا کام شروع کیا اور متعدد علاقوں میں مطالعہ قرآن کے حلقے قائم کیے۔ اللہ تعالیٰ

کے فضل وکرم سے اس کو قبولِ عام حاصل ہوا‘ تو مسجد خضراء سمن آباد کے منتظمین کی طرف سے مجھے اس مسجد میں خطابِ جمعہ کی دعوت ملی۔ اُس زمانہ میں یہ علاقہ کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ میں نے ۱۹۶۸ء کے اوائل سے اس کام کا آغاز کر دیا اور اس مسجد میں پہلے دو جمعوں میں ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کے موضوع پر تقریریں کیں — اس طرح مسجد خضراء قریباً دس سال تک پورے پاکستان کے لیے دعوت رجوع الی القرآن کا مرکز بنی رہی۔ مجھے اُس وقت اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے اس مسجد کو کیسے قبول فرمایا! مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوری ؒ نے رکھا تھا۔ اس مردِ درویش نے ارضِ لاہور میں چالیس برس تک درسِ قرآن دیا اور ارضِ لاہور کی فضا کو قرآن حکیم کی برکات سے مستفیض فرمایا اور قرآنی تعلیمات کی رُوح کو عام کیا — اب آپ دیکھئے کہ ان چیزوں میں کس قدر مناسبت ہوتی ہے۔ ظاہر بین نگاہوں میں اس کی قدر ومنزلت نہیں ہوتی‘ لیکن جن کی نگاہ حقائق پر اور باطن پر ہے وہ ان چیزوں کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ جس مسجد کا سنگ بنیاد اُس اللہ کے بندے کے ہاتھوں رکھا گیا تھا جو داعیٔ دعوتِ رجوع الی القرآن تھا‘ اس میں جب میں نے خطابِ جمعہ شروع کیا تو اسی موضوع سے کیا کہ ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کیا ہیں؟ جب کہ اُس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد اُنؒ کے دستِ مبارک سے رکھا گیا تھا۔

اس موضوع پر خطاب کرنے کا اُس وقت میرے ذہن میں خیال کیوں آیا؟ اس کی بھی بظاہر ایک وجہ تھی۔ وہ صدر ایوب کا دورِ حکومت تھا۔ آپ میں سے اکثر کو یاد ہو گا کہ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں مختلف جشن منائے جانے کا رواج شروع ہوا تھا۔ جیسے جشن خیبر‘ جشن مہران وغیرہ‘ جو دراصل ثقافت کے نام پر بے حیائی کے فروغ کے لیے محافل رقص وسرود کا مختلف عنوانوں سے انعقاد تھا۔ انہوں نے اپنے آخری دور میں مذہبی اور دینی مزاج کے لوگوں کو رشوت بھی دی تھی کہ ’’جشن نزولِ قرآن‘‘ بھی سرکاری سطح پر منا لیا جائے۔ یعنی ہمیں ثقافت کے نام پر اپنی من مانی کرنے دو‘ تم اپنے ذوق کی تسکین کے لیے قراءت کی محافل منعقد کر لیا کرو‘ سرکاری سطح پر سونے کے تاروں سے چالیس من وزنی قرآن مجید تیار کرالو‘ نزولِ قرآن کا جشن منالو‘ تاکہ دینی و مذہبی ذہن کے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ ہمیں بھی کچھ دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں اُس وقت مَیں نے کہا تھا کہ کیا قرآن مجید کے حقوق یہ ہیں؟ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سونے کے

تاروں سے قرآن مجید لکھا تھا؟ صحابہ کرامؓ نے تو اس قرآن کو اپنے سینوں میں جذب کیا تھا‘ اسے اپنی سیرتوں کا جزو بنایا تھا۔ صحابہ کرام ؓ تو اُن راستوں پر چلے تھے جو قرآن نے ان پر واضح کیے تھے۔ اُن میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس کے پاس پورا قرآن مجید کتاب کی شکل میں موجود ہو۔ اُس دَور میں طباعت واشاعت کے لوازمات کہاں تھے! کہاں تھے یہ آرٹ پیپر! (کاغذ ہی دستیاب نہیں تھا‘ آرٹ پیپر کا کیا سوال!) اور کہاں تھیں یہ روپہلی وسنہری خوشنما جلدیں! لیکن قرآن اُن کے دلوں پر نقش تھا‘ اُنؓ کی شخصیتوں کا جزوِ لاینفک بن چکا تھا اور اُنؓ کے پورے وجود میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ تھا قرآن کا حق جو انہوں نے ادا کیا تھا۔ عالم یہ تھا کہ کسی کے پاس ہڈی پر لکھی ہوئی چند سورتیں تھیں۔ اونٹ کے شانے کی ہڈی چوڑی بھی ہوتی ہے اور ہموار بھی۔ اس پر لکھتے تھے یا جھلیوں پر لکھتے تھے یا کسی کو کاغذ میسر آ گیا تو اس پر چند سورتیں لکھی ہوئی تھیں —— لیکن اس قرآن نے دنیا کو ہلا کے رکھ دیا۔ اس قرآن نے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ وہ ہمہ گیر انقلاب کہ آج بھی جب اس کی یاد تازہ کی جاتی ہے تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ بیس برس کے مختصر ترین عرصہ میں آج سے چودہ سو سال قبل اتنا عظیم وہمہ گیر انقلاب!!

قرآن مجید کے پانچ حقوق

مَیں اختصار کے ساتھ عرض کروں گا کہ ہر مسلمان کے ذِمّہ قرآن مجید کے پانچ حقوق ہیں۔ اگرچہ معاملہ بقدرِ استطاعت اور بقدرِ صلاحیت واستعداد ہوگا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط﴾ (البقرۃ:۲۸۶) ’’اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اُس کی وسعت کے مطابق ہی ذِمّہ دار اور مکلّف ٹھہراتا ہے۔‘‘ تاہم یہ بات سامنے رہنی چاہیے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے کہ ہم حصولِ دُنیا کے لیے تو خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اس تگ ودو میں ہماری استعداد واستطاعت اور اہلیت وصلاحیت کا بھرپور اور نتیجہ خیز مظاہرہ ہوتا ہے‘ لیکن دین کے لیے ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ذرا غور کیجیے اور انصاف فرمایئے کہ اگر صلاحیت واہلیت نہیں ہے تو دُنیوی کاموں میں کیسے ظاہر ہو رہی ہے! تمہارے کاروبار چمک رہے ہیں‘ تم اپنے پروفیشن میں نام پیدا کر رہے ہو۔ تم میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ایک نہیں‘ دو دو تین تین مضامین میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے‘ لیکن ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ عربی سیکھتے اور براہِ راست قرآن پڑھتے اور

سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ایسے لوگوں کا عدمِ صلاحیت واہلیت کا عذر اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ ہاں واقعتاً کسی میں استعداد نہ ہو‘ وہ پیدائشی غبی اور کند ذہن ہو‘ یا بیچارا حالات کی وجہ سے اَن پڑھ رہ گیا ہو تو ایسے لوگوں سے ان ہی اعتبارات سے مواخذہ ہوگا۔ لیکن اگر آپ میں صلاحیت واستعداد موجود ہے اور آپ نے اس کا رخ کسی اور طرف موڑ دیا ہے تو اس کی ذِمّہ داری آپ پر ہے۔ تاہم اصولاً یہی کہا جائے گا کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد قرآن مجید کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں۔

میں نے یہ حقوق قرآن وسُنّت سے ماخوذ کیے ہیں‘ اور وہ یہ ہیں:

- سب سے پہلا یہ کہ اسے مانو‘ جیسا کہ اسے ماننے کا حق ہے۔
- دوسرا یہ کہ اسے پڑھو‘ جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔
- تیسرا یہ کہ اسے سمجھو‘ جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔
- چوتھا یہ کہ اس پر عمل کرو‘ جیسا کہ عمل کا حق ہے۔
- اور پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچاؤ‘ جیسے اسے پہنچانے کا حق ہے۔ اس لیے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے اُمّتی کی حیثیت سے تمہارا یہ فرضِ منصبی ہے۔

یہ پانچ حقوق ہیں جن کو میں نے نہایت سادہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اب میں ان میں سے ہر ایک کی اختصار کے ساتھ وضاحت کروں گا۔ ویسے بحمد اللہ اس موضوع پر میرا کتابچہ موجود ہے۔ جن حضرات کے دلوں میں قدرے تفصیل جاننے کا اشتیاق پیدا ہو‘ ان سے میں گزارش کروں گا کہ وہ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا حق: اس پر ایمان لاؤ!

میں نے قرآن مجید کے یہ جو پانچ حقوق بیان کیے ہیں‘ ان میں سے ہر ایک کے لیے قرآن مجید اور سُنّت رسول ﷺ کی اصطلاحات ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے درجات ہیں۔ ماننے کی اصطلاح کیا ہے؟ ایمان! اب اس ایمان یعنی ماننے کے بہت سے درجے ہیں۔ کہاں حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا ایمان اور کہاں ہم میں سے کسی کا ایمان! ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک! —— حالانکہ ہے تو ایمان ہی‘ لیکن درجے مختلف ہیں۔ البتہ ایمان کے دو درجے سمجھنے بہت ضروری ہیں۔ ایک ماننا ہے قانونی درجہ میں کہ ہم نے زبان سے اقرار کر لیا کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ جب کہ ایک ماننا ہے دل کی گہرائی سے‘ جس سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ یہ واقعتاً

اللہ کا کلام ہے۔ اصل میں یہ ماننا اور یہ ایمان مطلوب ہے۔ اقرارٌ بِاللِّسان تو ہمیں خود بخود حاصل ہو گیا‘ کیونکہ ہم مسلمانوں میں پیدا ہو گئے۔ لہٰذا ہم زبان سے مانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ لیکن اس ماننے سے نہ اس کی طرف ہمارا التفات ہے‘ نہ توجّہ ہے‘ نہ ہم اسے پڑھتے ہیں اور نہ ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا کیا سوال! بس ایک کتابِ مقدس کے طور پر اسے مان لیا ہے۔ لیکن جب آپ دل کی گہرائی سے اور تصدیق بالقلب کی کیفیت سے مانیں گے کہ یہ واقعی اللہ کا کلام ہے تو پھر آپ کے دل میں اس کی عظمت پیدا ہو گی اور اس کی قدر و منزلت اور اہمیت کا شعور حاصل ہو گا۔ اس تصدیق قلبی کے بغیر اگلا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ اگر آپ کو اس کے کلام اللہ ہونے پر یقین قلبی ہی حاصل نہیں ہے تو آپ کاہے کو اسے پڑھنے پر وقت لگائیں گے! اس کو سمجھنے پر کاہے کو اپنی صلاحیتیں کھپائیں گے! کاہے کو آپ اس پر عمل کا کھکھیڑ مول لیں گے اور کاہے کو دوسروں تک پہنچانے کی ذِمّہ داری سنبھالیں گے! لہٰذا سب سے پہلے تو یقین کی ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

اب یہاں ایک عملی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقین کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب مَیں نے اپنے کتابچہ میں دیا ہے‘ لہٰذا جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ اس کا مطالعہ ضرور کر لیں۔

دوسرا حق: اس کی تلاوت کرو

اب آیئے دوسرے حق کی طرف۔ ’’اسے پڑھو جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے‘‘۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۲۱) ’’وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے‘‘۔ اس کا کیا مفہوم ہے! حق تلاوت کیا ہے؟ سب سے پہلے یہ کہ قرآن مجید کے حروف کے مخارج صحیح ادا ہو رہے ہوں۔ اس کا نام تجوید ہے۔ کبھی یہ ہماری تعلیم کا نقطۂ آغاز ہوا کرتا تھا۔ ہر مسلمان بچہ سب سے پہلے ’نورانی قاعدہ‘ یا ’یسرنا القرآن‘ پڑھا کرتا تھا۔ ان کے ذریعے سے اسے قرآن کے حروف کی شناخت اور ان کے مخارج کا صحیح علم اور ساتھ ہی قرآن مجید کے رموزِ اوقاف کا صحیح علم حاصل ہوتا تھا۔ ان سب کو سمجھ کر قرآن کو پڑھنا —— یہ پہلا اور ابتدائی حق ہے۔

پھر یہ کہ اس کا جتنا زیادہ سے زیادہ حصہ یاد کیا جا سکتا ہے اسے یاد کیا جائے۔ حفظِ قرآن کا الحمدللہ ہمارے یہاں پھر چرچا ہوا ہے اور اکثر لوگ اپنے کسی نہ کسی بچے کو بچپن میں ضرور حفظ کرا دیتے ہیں‘ بہت سے کھاتے پیتے گھرانوں میں بھی یہ روایت پڑ گئی ہے۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ تقسیم کے وقت جو شہر ہندوستان میں رہ گئے ہیں ان میں سے پانی پت‘ ٹونک‘ سہارن پور اور بہت سے دوسرے شہر ایسے تھے جن میں یہ خصوصی روایت تھی کہ ہر خاندان کم از کم ایک بچے کو ضرور حفظ کراتا تھا۔ جیسے انڈونیشیا میں ماضی قریب تک یہ روایت قائم رہی ہے کہ شادی کے فوراً بعد نو بیاہتا جوڑے حج کے لیے جاتے تھے۔ حج کے لیے بہترین عمر یہی جوانی کی عمر ہے اور پھر ابھی بال بچے بھی نہیں ہیں کہ جن میں دل پڑا رہے اور دورانِ حج میں وہ یکسوئی حاصل نہ ہو سکے جو مطلوب ہے۔ بہرحال ہمارے یہاں بھی تقسیم سے قبل یہ روایت رہی ہے کہ قریباً ہر خاندان میں ایک حافظ ہوتا تھا‘ اور اُس گھر کو منحوس سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی حافظ نہ ہو۔ اگرچہ اب یہ صورت حال تو باقی نہیں رہی‘ تاہم بفضلہ تعالیٰ چند برسوں سے بعض مخلص حضرات اور اداروں کی کوششوں سے حفظ قرآن کا کافی چرچا ہے۔ لیکن مَیں دوسرے حفظ کی بات کر رہا ہوں کہ ہر مسلمان یہ سمجھے کہ میرا اصل سرمایہ وہ قرآن ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے۔ ایک پارہ ہو‘ دو تین ہوں یا اس سے زیادہ ہوں‘ ان کی حفاظت کرتا رہے اور مزید اضافے کے لیے کوشاں رہے۔ اس حفظ قرآن سے کوئی مسلمان محروم نہ رہے۔ مجھے بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ بات عرض کرنی پڑ رہی ہے کہ ہماری مساجد کے اکثر و بیشتر ائمہ حضرات کا حال یہ ہے کہ قرآن کے چند مقامات اور گنتی کی سورتوں کے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔ جہری نمازوں میں انہی کو بار بار دہرا لیا جاتا ہے۔ اِلّا ماشاء اللہ! صاحب ذوق لوگ بھی ہیں‘ لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس اعتبار سے یہ بڑی محرومی ہے کہ قرآن کے حفظ میں اضافہ کے ذوق میں حد درجہ کمی ہو چکی ہے۔

تلاوتِ قرآن کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اسے اچھی سے اچھی آواز اور زیادہ سے زیادہ خوش الحانی سے پڑھا جائے۔ حضرت براء بن عازب ؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((زَیِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِکُمْ)) (رواہ احمد وابوداؤدوالنسائی وابن ماجه والدارمی) ’’قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو‘‘۔ اس معاملہ میں کوتاہی پر تنبیہ بھی فرمائی: ((لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ)) (رواہ البخاری) ’’جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں

سے نہیں!''

پھر اس کے آداب ہیں۔ تلاوت کے لیے باوضو دوزانو ہو کر قبلہ رخ بیٹھیں۔ مصحف کا ادب اور اس کی تعظیم کیجیے۔ تلاوت کی ابتدا تعوذ سے کیجیے —— البتہ ان آداب کے ضمن میں یہ بات جان لیجیے کہ جب تلاوت حصولِ ثواب یا تذکّر کی نیت سے کی جا رہی ہو تو ان آداب میں سے کسی میں بھی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر تعلیم و تعلّم یا درس و تدریس کے لیے قرآن پڑھا جائے' مثال کے طور پر جو بچے ناظرہ پڑھ رہے ہوں یا حفظ کر رہے ہوں' ان کو علماء کرام نے ان پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

مزید یہ کہ تلاوت کا معمول ہونا چاہیے۔ اللہ توفیق دے تو روزانہ زیادہ سے زیادہ حصّہ کی تلاوت کریں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین روزانہ قرآن کی ایک منزل تلاوت کر کے سات دن میں ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ جب کچھ عرصہ گزر گیا اور ہمارے ذوق وشوق اور جوش و جذبے میں کمی آ گئی تو قرآن مجید کو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا کہ چلیے روزانہ ایک پارہ پڑھ کر ہر مہینہ میں قرآن ختم کر لیا جائے۔ ماضی قریب میں ہمارے یہاں کثرت سے اس کا معمول تھا۔ مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ اکثر مسلمان یہ کوشش کرتے تھے کہ ایک پارہ کی روزانہ تلاوت کر لیں۔ لیکن آج کل اگر آپ کی روزانہ کی مصروفیات میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ آپ روزانہ ایک پارے کی تلاوت کے لیے بھی وقت نہیں نکال پاتے تو بر سبیلِ تنزل آپ پون پارہ پڑھیے' نصف پڑھیے' پاؤ پڑھیے' ایک رکوع ہی پڑھ لیجیے' لیکن اس کو زندگی کا معمول بنایئے۔ آپ کا کوئی دن تلاوتِ قرآن سے محروم نہ رہے---- یہ تمام چیزیں ''یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ'' میں شامل ہیں۔

تیسرا حق: اسے سمجھو اور اس پر غور و فکر کرو!

اب آیئے تیسرے حق کی طرف: ''قرآن کو سمجھو' جیسا کہ اسے سمجھنے کا حق ہے''۔ اس سمجھنے کے بھی دو درجے خاص طور پر قرآن مجید سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک سمجھنا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کہتے ہیں: ''تذکّر بالقرآن'' یعنی قرآن سے ہدایت و نصیحت حاصل کر لینا۔ اور ایک درجہ ہے: ''تدبّرِ قرآن'' یعنی قرآن پر غور کرنا۔ اب سمجھئے کہ غور کسے کہتے ہیں! یہ لفظ غار سے بنا ہے۔ عربی میں غار کہتے ہیں زمین میں بہت گہرے گڑھے کو۔ غور کرنے سے مراد ہوگا کہ قرآن کی گہرائیوں میں اترا جائے۔ علامہ اقبال نے اسے یوں تعبیر کیا کہ

ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' —— یہ قرآن علم و عرفان کا اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اس میں غوطے لگاؤ' اس کے علوم و عرفان' اس کے معارف و معانی اور حقائق و مفاہیم کے موتی و جواہر کی جستجو کرو اور ان کو نکال کر لاؤ۔

تذکر کے لیے قرآن بہت آسان ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ القمر میں اللہ تعالیٰ نے چیلنج کے انداز میں چار مرتبہ فرمایا: ﴿وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ۝﴾ (آیات ۱۷'۲۲'۳۲'۴۰) یعنی ''ہم نے ذکر کے لیے' نصیحت و یاددہانی کے لیے' اور ہدایت اخذ کرنے کے لیے قرآن کو آسان بنا دیا ہے' تو ہے کوئی اس یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والا اور اس سے نصیحت اخذ کرنے والا!'' —— اس تذکّر بالقرآن کے لیے صرف ایک چیز ضروری ہے' وہ یہ کہ اتنی عربی آپ کو آنی چاہیے کہ جب آپ قرآن پڑھیں تو اس کا ایک سادہ سا مفہوم روانی کے ساتھ آپ کے قلب پر اترتا اور اسے منور کرتا چلا جائے —— اس لیے کہ جب آپ ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور نتیجتاً اصل تاثیر نہیں رہتی' اگرچہ علم تو حاصل ہوتا ہے۔ علم کا تعلق ذہن سے ہے اور تأثر کا قلب سے۔ قرآن کا جو اثر انسان کے جذبات پر پڑنا چاہیے' ترجمہ اور حواشی کی طرف بار بار رجوع کرنے سے اس تاثر کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ قرآن کی تاثیر سے جذبات میں جو ارتعاش برپا ہونا چاہیے اور قرآن کو آپ کے باطن کی گہرائیوں میں اتر کر آپ کے قلب کے تاروں کو جو چھیڑنا چاہیے تو وہ تار نہیں چھڑتے —— یہ ضرور ہے کہ ترجمہ اور حواشی کی مدد سے قرآن پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تھوڑی بہت عربی آتی ہو اور تسلسل کے ساتھ تلاوت ہو تو اس کی اپنی تاثیر ہے۔ البتہ کوئی اشکال محسوس ہو یا کوئی ثقیل یا نامانوس لفظ آجائے تو ترجمہ اور حواشی کی طرف رجوع کرنا مفید ہوتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجیے کہ قرآن مجید نہایت سلیس اور سادہ زبان میں ہے۔ یہ عربی مبین ہے' یعنی روشن عربی۔ بلکہ اسے ادب کی اصطلاح میں ''سہلِ ممتنع'' کہنا درست ہوگا کہ انتہائی آسان الفاظ ہیں' انتہائی اعلیٰ مضامین و مفاہیم ادا کیے جائیں۔ لہٰذا میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ تذکّر بالقرآن کے لیے عربی کی اس قدر تحصیل ضروری ہے کہ قاری قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ سمجھ سکے۔ اسے مشکل نہ سمجھئے۔ عربی زبان کو خواہ مخواہ 'ہوا' بنا دیا گیا ہے جبکہ یہ بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ اسے بہت جلد سیکھ سکتے ہیں جنہوں نے بی اے اور

ایم اے کیا ہو یا ڈاکٹر اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم وفنون حاصل کیے ہوں۔ لیکن اس کے لیے لگن اور ضرورت کا شدید احساس ناگزیر ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں اور تجربات کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ تذکیر‘ نصیحت اور یاددہانی حاصل کرنے کے لیے اس شخص کے لیے قرآن بڑی سادہ کتاب ہے‘ جس نے عربی زبان کی صرف ونحو کے چند بنیادی اصول سیکھ لیے ہوں اور ان کی تمیز حاصل کر لی ہو۔ اس لیے کہ قرآن کا اصل موضوع اور اساسی مضامین فطرتِ انسانی کے جانے پہچانے ہیں اور قرآن کو بامعنی پڑھتے ہوئے ایک سلیم الفطرت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے باطن میں مستور بدیہیات سے واقف ہو رہا ہے اور اپنی فطرت کی آواز کو دل کے کانوں سے سن رہا ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کا طرزِ استدلال منطقی نہیں ہے۔ وہ آفاق وانفس کی نشانیوں سے انسان کو جگاتا اور اُسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ پھر یہ کہ مشکل مضامین کو نہایت سادہ اور دل نشین مثالوں کے ذریعے سے آسان بنا کر قلب پر اثر ڈالتا ہے۔ اس پر نُوْرٌ عَلٰی نُوْر قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور سلاست کی وہ معراج ہے جس کے سامنے عرب کے نامی گرامی شعراء‘ خطباء اور ادباء سرنگوں ہو گئے تھے اور انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

البتہ ’’تدبرِ قرآن‘‘ وہ شے ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ خود نبی اکرم ﷺ سے ایک طویل حدیث میں قرآن حکیم کے بارے میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ)) ’’اور اہلِ علم اس (کتاب) سے کبھی سیر نہ ہو سکیں گے‘‘۔ اور ((وَلَا یَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ، وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ)) (رواہ الترمذی) ’’اور نہ کثرت وتکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی واقع ہو گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم ومعارف کے خزانے) کبھی ختم ہو سکیں گے‘‘۔ علماءِ حقانی اس قرآن پر غور وتدبر کرتے رہیں گے‘ اس کام میں ساری ساری عمریں لگا دیں گے۔ کتنے ہی امام رازیؒ‘ امام زمخشریؒ اور ان کے پائے کے بے شمار مفسرینِ قرآن آئیں گے جو یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوں گے کہ ع ’حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا‘۔ قرآن مجید میں کتنے ہی مقامات ایسے آئیں گے کہ بڑے بڑے فضلاء‘ علماء اور مفکّرین گھٹنے ٹیک دیں گے اور یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ: اِعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِیْقٌ مُھِیْبٌ ’’ہوشیار ہو جاؤ کہ یہ مقام بہت مشکل ہے‘ بہت گہرا ہے‘ بہت غامض ہے‘ بہت پُرہیبت ہے‘‘۔ امام رازیؒ کو یہ کہنا پڑ رہا

ہے‘ تو‘ تا بہ دیگراں چہ رسد!

اس کی ایک مثال مَیں نے اپنے کتابچے میں دی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ’’میں نے صرف سورۃ البقرۃ پر آٹھ سال تک تدبر کیا ہے‘‘۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ انہیں نہ عربی سیکھنی تھی اور نہ صرف ونحو پڑھنے کی ضرورت تھی۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور زبان کی خطابت اور زبان دانی کا چرچا تھا اور انہیں شانِ نزول کی روایات کی چھان بین کرنے کی بھی کوئی احتیاج نہیں تھی۔ وہ تو خود اُس ماحول میں رہ رہے تھے جس میں قرآن نازل ہو رہا تھا۔ حضور ﷺ سے نہایت قرب رکھتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر فقیہہ الاُمّت کے فرزند ہیں۔ لیکن صرف سورۃ البقرۃ پر تدبّر اور غور وفکر میں آٹھ سال لگائے ہیں۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ پورا قرآن سورۃ البقرۃ سے بارہ تیرہ گنا ہے‘ تو کسی کی سوا سو برس کی عمر ہو تو شاید وہ اس طریقے سے قرآن پر قابل لحاظ حد تک تدبر کر سکے۔ البتہ اتنی عمر صرف کر کے بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ مَیں نے قرآن کے معانی آخری حد تک جان لیے ہیں اور مَیں نے اس کی تہہ تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ لیکن بایں ہمہ قرآن کریم نے اپنے محل تدبّر ہونے کو بایں الفاظ مبارکہ خود واضح کیا ہے: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْۤا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹﴾ (صٓ) ’’یہ قرآن ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے (اے نبی ﷺ!) آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبّر (وتفکّر) کریں اور تاکہ ہوش مند لوگ نصیحت حاصل کریں‘‘ —— آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دونوں اصطلاحات آ گئیں‘ یعنی تدبرِ قرآن اور تذکر بالقرآن‘ جن کا میری گفتگو کے اس حصہ سے تعلق ہے۔

پھر قرآن پر عدمِ تدبر کا گلہ ان الفاظ میں خود قرآن میں موجود ہے: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴾ (النساء: ۸۲) ’’کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟‘‘ پھر یہی شکوہ سورۂ محمدؐ میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝۲۴﴾ ’’کیا یہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟ یا دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟‘‘ —— قرآن حکیم پر تدبر اور غور وفکر کا حقیقی تقاضا ہے کہ اس کام کے لیے لوگ اپنی زندگیاں لگا دیں‘ کھپا دیں۔ یہ اتنا عظیم ترین کام ہے کہ اس کو ظاہر فرمانے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((خَیْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ))

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔''

یعنی قرآن کی تعلیم و تعلّم کو اپنی زندگی کا اوّلین مقصد بنالو‘ اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دو‘ اس کو اپنا کیریئر بنالو۔ اس سے اعلیٰ کام کوئی نہیں۔ یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور اس کے راوی خلیفۂ راشد ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان ؓ ہیں‘ جن کی مظلومانہ شہادت سے عرشِ الٰہی تھرا اٹھا تھا۔ پس نوٹ کر لیجیے کہ قرآن کو سمجھنے کے لیے دو درجے ہو گئے۔ ایک تذکّر بالقرآن اور دوسرا تدبر قرآن۔

چوتھا حق: اس پر عمل کرو

اب آیئے چوتھے حق کی طرف: ''قرآن پر عمل کرو جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے''۔ ظاہر بات ہے کہ عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں! بلکہ وہ علم سخت ترین باز پرس کا باعث بن جائے گا جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ ایسا علم کسی درجہ میں بھی نفع کا ذریعہ بننے کے بجائے الٹا نقصان کا موجب بن جائے گا۔ اس لیے کہ علم کے مطابق عمل ہونا لازم ہے[1]۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهُ)) (سنن الترمذی) ''جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرا لے وہ قرآن پر ایمان ہی نہیں رکھتا'' —— گویا وہ جھوٹ بولتا ہے کہ میرا قرآن پر ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن خود دوٹوک فیصلہ سناتا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿٤٤﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٥﴾ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤٧﴾﴾ (المائدۃ) ''اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اللہ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں...... تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں...... تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو اللہ کی نازل کردہ کتاب‘ شریعت اور قوانین و ضوابط کے مطابق فیصلے نہیں کرتے‘ تین بڑے جرائم کا مرتکب قرار دیا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ کافر ہیں۔

(۱) ''الاتقان فی علوم القرآن'' کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے ''مبادیٔ تدبر قرآن'' میں روایت نقل کی ہے کہ ''ابوعبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھتے پڑھاتے تھے‘ جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان اور عبداللہؓ بن مسعود وغیرہ کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی اکرم ﷺ سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے تو آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورۃ کے حفظ میں وہ برسوں لگا دیتے تھے۔''

ان کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ اگر یہاں ظلم کے لغوی معنی مراد لیے جائیں تو ان کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ اللہ کے احکام عدل و قسط پر مبنی ہوتے ہیں‘ لہٰذا اس سے ہٹ کر ہر فیصلہ ظلم قرار پائے گا۔ اور یہ ایک نوع کا شرک ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ فسق کے معنی ہیں اپنی جائز حدود سے تجاوز کرنا‘ مراد ہے اللہ کی نافرمانی کرنا —— ان آیات کے سیاق میں قرآن سے پہلے نازل کردہ دو کتبِ الٰہی تورات و انجیل کا ذکر ہے‘ جب کہ آیت ۴۷ کے متصلاً بعد آیت ۴۸ میں نزولِ قرآن کا ذکر ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) اب ہم نے آپ پر بھی کتاب برحق نازل کی ہے (یعنی قرآن مجید) جو اُن کتابوں کی جو پہلے سے موجود ہیں تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ بھی ہے‘ پس جو کچھ اللہ نے آپ پر نازل کیا ہے‘ آپ اُسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور جو حق آپ کے پاس آچکا ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں۔''

سورۃ المائدۃ میں یہ بات باعادہ و تکرار فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے وہ اس لیے نازل فرمایا ہے کہ اس کے مطابق فیصلے کرو۔ قرآن اس لیے نازل فرمایا کہ اس پر مبنی نظام قائم کرو‘ اس کے مطابق اپنے تمام جھگڑے نمٹاؤ۔ شریعت اس لیے نازل فرمائی کہ اس پر عمل پیرا ہو۔ اگر انفرادی و اجتماعی معاملات میں قرآن پر عمل نہیں اور نہ عمل کا ارادہ ہے تو قرآن کو اللہ کی کتاب ماننا‘ اس کی تلاوت کرنا اور اسے سمجھنا بے کار ہو جائے گا۔ میری اس بات کو نبی اکرم ﷺ کے دو اقوال مبارک سے سمجھیے۔ پہلا قول ہے: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَکَ اَوْ عَلَيْکَ)) (صحیح مسلم) ''قرآن یا تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا''۔ یعنی اگر تمہارا عمل اس کے مطابق ہوگا تو تمہارا شفیع بنے گا‘ بصورت دیگر تمہارے خلاف مستغیث بن کر کھڑا ہوگا اور دعوے دار ہوگا کہ اے اللہ! یہ شخص مجھ پر ایمان رکھنے کا مدعی تھا‘ میری تلاوت کرتا تھا‘ مجھے سمجھنے کے لیے وقت صرف کرتا تھا‘ لیکن اس نے میری ہدایات و تعلیمات پر نہ عمل کیا اور نہ عمل کرنے کا عزم و ارادہ کیا۔

دوسرا قول مبارک ہے: ((اَکْثَرُ مُنَافِقِيْ اُمَّتِيْ قُرَّاءُهَا)) (مسند احمد) ''میری

اُمّت کے منافقین کی بڑی تعداد قراء پر مشتمل ہوگی‘‘۔ یہاں قاری سے مراد عالم ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جو قاری ہوتا تھا وہی عالم بھی ہوتا تھا۔ ہمارے یہاں اس وقت جو تقسیم نظر آتی ہے کہ قاری اور ہے‘ عالم اور ہے‘ جو تجوید جانتا ہو اور قرآن کی خوش الحانی سے قراءت کرتا ہو‘ وہ ہمارے نزدیک قاری ہے چاہے وہ عربی بالکل نہ جانتا ہو‘ وہاں اس کا تصور ہی نہیں تھا۔ عالم ہی کو قاری کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمّت کے منافقین میں اکثریت قُرّاء یعنی علماء کی ہوگی۔ ایسا کیوں ہوگا؟ اس لیے کہ سب سے زیادہ علم ان کے پاس ہوگا اور اگر علم کے مطابق عمل نہ ہوا تو ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ (الصّف) کی زد میں سب سے پہلے وہی آئیں گے۔ جس بے چارے کا علم تھوڑا ہے اور اُس نے اس کے مطابق عمل کر لیا تو وہ اللہ کے یہاں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن جو علم کے لحاظ سے کوہِ ہمالیہ ہے لیکن عمل کے اعتبار سے کچھ نہیں تو وہ یقیناً حضور ﷺ کے اس قول کی زد میں آ رہا ہے کہ ((اَکْثَرُ مُنَافِقِیْ اُمَّتِیْ قُرَّاءُھَا)) —— اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ لہٰذا سلامتی کی راہ ایک ہی ہے کہ قرآن کا جتنا بھی علم حاصل ہو اس پر حتی الامکان فوری طور پر عمل شروع کر دیا جائے۔

لیکن اس عمل کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک انفرادی عمل کا دائرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو! یہ آپ پڑھ سکتے ہیں‘ یہ تو انگریز کے دورِ استعمار میں بھی پڑھی جاتی تھی اور اس حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی‘ جو چاہے پڑھ سکتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ماہِ رمضان کے روزے رکھو! آپ رکھ سکتے ہیں‘ امریکہ میں ہوں‘ ہندوستان میں ہوں‘ خالص اور کٹر کافروں میں ہوں‘ تب بھی رکھ سکتے ہیں‘ کوئی پابندی نہیں‘ یہ آپ کا ذاتی فعل ہے۔ ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا‘ نبی اکرم ﷺ نے اس کا نصاب اور مقادیر مقرر فرما دیں‘ آپ آج بھی اسے ہر قسم کے ماحول میں ادا کر سکتے ہیں‘ کوئی قانون اس راہ میں حائل نہیں ہوگا۔ اب میری بات غور سے سماعت فرمایئے۔ احکامِ شریعت کا ایک دائرہ ہر مسلمان کے انفرادی عمل اور اس کی نجی زندگی سے متعلق ہے۔ اس انفرادی عمل کے لیے ہر مسلمان ہر وقت اور ہر آن مکلّف ہے۔ اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ فسق ہے‘ نافرمانی ہے‘ عصیان و عدوان ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا ماحول ٹھیک نہیں تھا‘ یا ہمارے یہاں اسلامی نظام قائم نہیں تھا‘ اس لیے وہ بے عمل رہا۔ اگرچہ نظام قائم نہیں‘ لیکن آپ نماز تو پڑھ سکتے

ہیں‘ جہاں مسجدیں نہیں وہاں گھر میں پڑھ سکتے ہیں۔ مسلمان معاشرہ موجود نہیں‘ لیکن بہرحال روزہ تو تمہیں رکھنا ہے۔ اگر تم صاحبِ نصاب ہو تو معاشرے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستحقین تک زکوٰۃ تو پہنچا سکتے ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کی پابندی کرنا تو تمہارا ذاتی فعل ہے کہ تم حرام کھاتے ہو یا اس سے اجتناب کرتے ہو۔ عورتوں کو اُن کا حقِ وراثت ادا کرتے ہو یا رواج کے نام پر اور غیر مسلموں کی تقلید میں اللہ کے قانونِ وراثت کو پامال کرتے ہو۔ اسی طرح تم داڑھی رکھتے ہو یا نہیں رکھتے۔ یا تو تم نے داڑھی کو نبی اکرم ﷺ کی سُنّت نہیں سمجھا اور بہت بڑے دھوکہ میں رہے‘ یا تم نے یہ سمجھا کہ سُنّت پر عمل ضروری نہیں ہے۔ یہ خالصتاً تمہارے ذاتی معاملات ہیں‘ ان کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔ دین کا جو یہ حصّہ ہے تو اس میں کسی رعایت کا سوال ہی نہیں ہے۔

اسی انفرادی عمل کے دائرے میں ایک نہایت اہم معاملہ اور آتا ہے جس سے ہم روز بروز نہ صرف غفلت برت رہے ہیں بلکہ نہایت ڈھٹائی کا وطیرہ اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں‘ اور وہ ہے ستر و حجاب یعنی پردے کا مسئلہ —— اور تمام تمدنی طور طریقوں میں مساواتِ مرد و زن اور ہر میدان میں عورتوں کا مَردوں کے شانہ بشانہ حصّہ لینے کا مکروہ ہی نہیں‘ قرآنی احکام اور سُنّت کے خلاف طرزِ عمل —— اگر اللہ نے پردے کا حکم دیا ہے‘ ستر و حجاب کے احکام نازل کیے ہیں‘ اور مرد و عورت کے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کا تعین فرمایا ہے تو تاحال کوئی ایسا آرڈیننس آپ پر نافذ نہیں ہوا کہ آپ کو قانوناً ان اوامر کی خلاف ورزی اور نواہی پر عمل پیرا ہونے کے لیے مجبور ہونا پڑے۔ حکومت کی سطح پر اور مغرب زدہ طبقات کی طرف سے تحریص و ترغیب اور تشویق کا جو سیلاب ذرائع ابلاغ کی صورت میں آیا ہوا ہے‘ اسے تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیجیے‘ ہم فی الوقت اس معاملہ میں آزاد ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کے مختار ہیں۔

ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے پردے کے خلاف آرڈیننس جاری کر دیا تھا اور برقعہ یا چادر اوڑھنا ممنوع قرار دے دیا تھا‘ لیکن قریباً پچاس سال کی تاریخ گواہ ہے کہ ترکوں نے مِن حیث القوم اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس حکم کی اُس وقت سے تاحال مخالفت و مزاحمت اور مقاومت جاری ہے‘ جبکہ آج بھی وہاں ان لڑکیوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکالا جا رہا ہے جو چہروں پر نقاب ڈال کر آتی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی اول و دوم نے بھی ایران میں آرڈی ننس کے ذریعہ سے

پردہ اور ستر وحجاب کے قوانین شریعت کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ خود ختم ہو گئے اور اب ایران میں پردہ اور ستر وحجاب کا جس قدر اہتمام ہے شاید ہی کسی دوسری مسلمان مملکت میں ہو۔ لیکن یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے کہ یہاں ستر وحجاب کے اسلامی قوانین آپ کے گھروں میں پامال ہو رہے ہیں۔ اس کی پوری ذمہ داری آپ پر ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ سے اس بارے میں بڑی سخت باز پُرس ہوگی۔ اس لیے کہ یہاں ایسا کوئی آرڈیننس موجود نہیں ہے کہ خواتین برقعے اتار دیں‘ بے حجابانہ سڑکوں پر‘ مارکیٹوں میں‘ تفریح گاہوں میں مٹرگشت کریں۔ یہ لعنت ہم نے خود اپنے اوپر مسلّط کی ہے۔ حال یہ ہو گیا ہے کہ جس کے پاس چار پیسے ہو گئے اس کے گھر کی خواتین نے برقعہ اتار پھینکا۔ گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ برقعے کی ’’لعنت‘‘ صرف غریب کے لیے ہے۔ یہ ہم نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کیا ہے۔ جس کو مالی حیثیت سے آسودگی حاصل ہوئی‘ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ پردے اور ستر وحجاب کے شرعی احکام کو پاؤں تلے روند ڈالا۔

اسی لیے میں کہا کرتا ہوں اور یہ بات بہت سوں کو بڑی ناگوار گزرتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں‘ لیکن ہم دنیا کے مہاجر تھے‘ دین کے مہاجر نہیں تھے۔ اگر خالصتاً دین کے لیے ہجرت کی ہوتی تو یہ نقشے نظر نہ آتے کہ وہ گھرانے جن کی عورتوں کی حفیظ جالندھری کے اس مصرع کے مصداق یہ کیفیت تھی کہ ؏ ’’چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی ان کی جھلک!‘‘ جن کا دستور یہ تھا کہ اول تو باپردہ ڈولیوں میں آنے جانے کا التزام تھا‘ لیکن اگر تانگوں میں بیٹھنا ہوتو نہ صرف یہ کہ برقعوں سمیت بیٹھتی تھیں بلکہ ان تانگوں کے چاروں طرف چادریں تنا کرتی تھیں‘ آج وہی گھرانے ہیں جن کی بہو بیٹیاں‘ پوتیاں اور نواسیاں آج سڑکوں پر بے حجاب ہی نہیں‘ نیم عریاں لباس میں گھومتی پھرتی نظر آ رہی ہیں۔

ایسی عورتوں پر حضور ﷺ نے لعنت فرمائی ہے جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ ؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ)) (صحیح البخاری)

’’دنیا میں بہت سی کپڑے پہننے والیاں آخرت میں ننگی ہوں گی۔‘‘

لباس تو پہنا ہوا ہے‘ لیکن اتنا باریک ہے کہ اس سے جسم جھلک رہا ہے‘ یا لباس تنگ ہے کہ عورت کے لطیف جسم کے دلفریب اعضاء نمایاں ہو کر دعوتِ گناہ دیتے ہیں‘ یا وہ اعضاء جیسے سینہ کا بالائی

حصّہ‘ گردن‘ چہرہ‘ سر اور پورے کے پورے بازو کھلے ہوئے ہیں جن کا ڈھانپنا ازروئے شرع ضروری ہے —— تو یہ ننگی ہیں۔ ننگی عورتیں آج برسرِعام گھوم پھر رہی ہیں‘ اور یہ تمام خواتین مسلمان کہلاتی ہیں۔ بہرحال یہ بھی انفرادی عمل ہے۔ اس کے بارے میں ہرگز ہرگز یہ عذر قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ ہمارے ساتھ یہ مجبوری تھی یا وہ مجبوری تھی۔ یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔ اگر آپ کا اپنے گھر پر قابو نہیں ہے تو پھر بحیثیت مرد گھر کے قوام اور حاکم نہیں ہیں‘ محکوم ہیں —— اور محکومی سے آزاد ہونے کی کوشش کرنا‘ محکومی کے بندھن توڑ دینا ایک مردِ حُر کی شان ہوتی ہے۔

لیکن اس سے آگے عمل کا ایک دائرہ اور ہے۔ وہ دائرہ یہ ہے کہ قرآن کے بعض تشریعی احکام وہ ہیں کہ جب تک نظام نہ بدلے ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا‘ یہ آپ نہیں کاٹ سکتے۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت پر زنا کی حد یہ ہے کہ ان پر سو سو کوڑے برسائے جائیں‘ یہ سزا آپ نہیں دے سکتے۔ شادی شدہ مرد یا عورت کے زنا میں ملوث ہونے کی حد رجم یعنی سنگسار کرنا ہے‘ یہ کام آپ نہیں کر سکتے۔ قتلِ عمد میں مقتول کے ورثاء کے ہاتھ میں فیصلہ کا حق ہے کہ وہ چاہیں تو معاف کریں‘ چاہیں تو خون بہا میں کوئی رقم لے کر چھوڑ دیں اور چاہیں تو قصاص میں اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں‘ آپ از خود یہ فیصلے نہیں کر سکتے۔ اسی طرح قتلِ ناحق کی دیت کا معاملہ ہے اور دوسرے بھی قوانین ہیں جن پر انفرادی طور پر کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔ یہ قوانین ملک کے اجتماعی نظام سے متعلق ہیں۔ ان کا نفاذ اسی وقت ہوسکتا ہے جب حکومت کی سطح پر فیصلے ہوں۔

اسی طرح سود کی حرمت کا معاملہ ہے۔ اس سے آپ انفرادی طور پر تو بچ سکتے ہیں اور جس حد تک بھی بچ سکیں‘ یہ آپ پر واجب ہی نہیں فرض ہے۔ البتہ ملک کے اقتصادی نظام کو سود کی غلاظت سے پاک کرنا انفرادی طور پر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا تعلق بھی ملک کے اجتماعی نظام سے ہے۔ اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ کوئی شخص چاہے سود سے بچ جائے لیکن سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا۔ یہ تو جب ہی ممکن ہوگا جب الصادق والمصدوق ﷺ کی پیشین گوئی کے مطابق پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے اور ان شاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔ آج کوئی دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ سود کے غبار سے بچا ہوا ہے۔ لیکن ایک مسلمان بندہ یہ تو کرسکتا ہے کہ ساری عمر کرائے کے مکان میں رہے اور سودی قرضہ لے کر بنگلہ اور کوٹھی نہ بنائے —— جب کہ کتنے ہی حاجی ہیں اور کتنے ہی مسجدوں کے متولی اور منتظمین ہیں‘ جنھوں نے سودی قرضے

لے کر بلڈنگوں پر بلڈنگیں کھڑی کر رکھی ہیں‘ اور بینک کے سود سے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا کاروبار جمایا جا رہا ہے۔

بہرحال آپ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ جن اسلامی احکام وقوانین پر نظام کے بدلنے کی صورت ہی میں عمل درآمد ہوسکتا ہے اور ہم اس معاملہ میں مجبور ہیں تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی؟ وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو بدلنے کی کوشش کرو! اگر جدّوجُہد کر رہے ہو‘ تن من دھن لگا رہے ہو‘ وقت صرف کر رہے ہو‘ توانائیاں اور قوتیں کھپا رہے ہو‘ تب تو اللہ کے ہاں بَری ہوجاؤ گے اور یہ کہہ سکو گے کہ اے ربّ‘ جو کچھ ہمارے بس میں تھا اس سے ہم نے دریغ نہیں کیا۔ لیکن اگر یہ کام‘ یہ جدّوجُہد‘ یہ سعی وکوشش نہیں کر رہے اور اسی ماحول میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور اپنے معیارِ زندگی کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے اور مال دار ہی نہیں خالص سرمایہ دار بننے میں روز وشب صرف ہو رہے ہیں‘ ساری بھاگ دوڑ‘ ساری تگ ودو‘ ساری توجہات دنیا کمانے میں صرف ہو رہی ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ دین کے اس حصّہ پر جس کا تعلق اجتماعی نظام سے ہے‘ عمل پیرانہ ہونے کے بھی آپ اللہ کے ہاں مجرم قرار پائیں گے۔

یہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے کہ نظام کو بدلنے کی سعی وکوشش کا طریق کار کیا ہے! اس ضمن میں ’’استحکامِ پاکستان‘‘ کے عنوان سے میرے جو مضامین قسط وار روزنامہ جنگ میں شائع ہوئے تھے‘ وہ اسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ’’اسلامی انقلاب‘‘ کے منہج کے کچھ نہ کچھ خدوخال آپ حضرات کے سامنے آسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں میری دس تقاریر ’’منہجِ انقلاب نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام‘‘ یعنی سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ‘ فلسفہ انقلاب کے نقطہ نظر سے‘‘ کے موضوع پر ماہنامہ میثاق میں شائع ہوچکی ہیں اور ان کے کیسٹس بھی موجود ہیں[۱]۔ میں نے اسلامی انقلاب کا جو طریق ومنہج سیرت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ کے نتیجہ میں اخذ کیا ہے‘ اور جو حضور ﷺ ہی کی سیرتِ مطہرہ سے مستنبط کیا ہے اُسی کو میں نے ان تقاریر میں بیان کیا ہے۔

اصولی طور پر یہ بات گرہ میں باندھ لیجیے کہ عمل بالقرآن کے ذیل میں ایک انفرادی عمل ہے۔ اس پر ہر دم‘ ہر لحظہ‘ ہر آن‘ ہر مسلمان مکلف ہے‘ میں بھی مکلف ہوں اور آپ بھی۔ عمل نہیں

(۱) الحمدللہ یہ دس تقاریر اسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوتی ہیں۔ (ادارہ)

کر رہے تو ہم میں سے کوئی بھی عدالت خداوندی میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ ہاں عمل بالقرآن کے ضمن میں اجتماعی نظام سے متعلق جو حصے ہیں‘ ان پر اُس وقت تک عمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ نظام نہ بدلے۔ نظام بدلنے کا نام ہی انقلاب ہے۔ اس انقلابِ اسلامی کو برپا کرنے کی جدّوجُہد کرنا‘ اس کے لیے سعی وکوشش کرنا‘ اس کے لیے محنت ومشقت جھیلنا‘ اس کے لیے تن من دھن لگانا‘ یہ چیزیں گویا قائم مقام ہوجائیں گی‘ دین کے ان حصوں پر عمل کرنے کی جن پر غیر اسلامی نظام کے مسلط ومستولی ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے‘ وہ علیم بالذات الصدور ہے۔ اگر ہم اُس کے دین کی اجتماعی نظام پر اقامت کے لیے‘ خلوصِ دل سے اور صحیح نہج پر جدّوجُہد کرتے رہیں گے تو توقع ہے کہ وہ غفور ورحیم ہماری ان مساعی کو نظام سے متعلق حصوں پر عمل پیرانہ ہونے کے عذر کے طور پر قبول فرمالے گا۔

پانچواں حق: اسے دوسروں تک پہنچاؤ

اب آیئے پانچویں اور آخری حق کی طرف۔ ماننے‘ پڑھنے‘ سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ قرآن مجید کا ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد یہ حق بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اسے پھیلائے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اس کے لیے قرآن حکیم کی اصل اور جامع اصطلاح ’’تبلیغ‘‘ ہے۔ اس تبلیغ کے ضمن میں خاتم النّبیین‘ سیّد المرسلین جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع میں اپنے آخری خطبہ میں یہ ذِمّہ داری امت کو منتقل فرمائی۔ آپؐ نے پہلے تو سوال کیا: ((اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ ؟)) ’’لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟‘‘ اور پورے مجمع نے جواب میں عرض کیا: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ ’’(حضور ﷺ!) بے شک ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا فرمادیا‘ حقِ امانت ادا فرمادیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا‘‘۔ نبی اکرم ﷺ نے یہی سوال تین مرتبہ دہرایا —— اور تین دفعہ جواب لے کر پھر آپؐ نے آسمان کی طرف اپنی انگشت مبارک اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ’’اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا‘‘ —— یہ مان رہے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام‘ تیرا کلام‘ تیرا دین ان تک پہنچا دیا۔ پھر اُن لوگوں سے جو حجۃ الوداع کے موقع پر موجود تھے اور جن کی تعداد بعض روایات میں سوا لاکھ تک آئی ہے‘ مخاطب ہو کر فرمایا:

((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))

’’اب پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں اُن لوگوں تک جو موجود نہیں!‘‘

اس لیے کہ میری رسالت صرف تمہارے لیے نہیں ہے۔ میں تو پوری نوعِ انسانی کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں: ﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸) پوری نوعِ بشر تک قرآن کی تبلیغ میری ذِمّہ داری ہے۔ میں نے تم تک پہنچا دیا۔ اب میری طرف سے تم ذِمّہ دار ہو کہ اسے بنی نوعِ آدم تک پہنچاؤ۔ تبلیغ قرآن کی یہ ذِمّہ داری ہے جو نبی آخر الزمان ﷺ نے اُمّت کے سپرد فرما کر الرَّفِيْقُ الْاَعْلٰی کی طرف مراجعت فرمائی۔

تبلیغ قرآن کی اس ذِمّہ داری کو نبی اکرم ﷺ نے اس درجہ عام کیا ہے کہ ارشاد فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً)) (صحیح البخاری) ’’پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت‘‘۔

یہاں ’’عَنِّیْ‘‘ کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ انگریزی میں ’on my behalf‘ جو مفہوم ادا کرتا ہے بالکل وہی مفہوم ’’عَنِّیْ‘‘ کا ہے — اس حدیث کے ضمن میں لوگوں کو کچھ مغالطے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کا بیان کرنا‘ اس کو پھیلانا اور اس کی تبلیغ کرنا تو صرف ان علماء کرام کا کام ہے جنہوں نے چودہ یا سترہ علوم پڑھ رکھے ہوں۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اصل میں چودہ یا سترہ علوم واقعتاً ضروری ہیں لیکن اُن کے لیے جو مسندِ افتاء پر بیٹھے ہوں‘ جنہیں فتاویٰ دینے ہوں کہ کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے! کیا حلال ہے کیا حرام ہے! فلاں مسئلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے! فلاں اُلجھن میں شریعت کیا حل بتاتی ہے! نکاح وطلاق کے احکام کیا ہیں! وراثت کے قوانین کیا ہیں! مضاربت ومشارکت کے قواعد وضوابط کیا ہیں۔ اور بہت سے وہ تشریعی وفقہی مسائل جن سے لوگوں کو تمدنی زندگی میں بار ہا سابقہ پیش آتا ہے۔ یہ واقعتاً بہت بڑی ذِمّہ داری ہے۔

مَیں اس کی اہمیت کی وضاحت کے لیے یہ بات نہایت زور دے کر کہہ رہا ہوں۔ اگر کوئی حدیث اور فقہ کا ماہر نہیں‘ قرآن وحدیث کے ناسخ ومنسوخ سے واقف نہیں‘ مختلف ائمہ فقہ کی آراء سے ناواقف ہے اور ان کے دلائل کو نہیں جانتا تو وہ کسی مسئلہ میں فتویٰ کیسے دے سکے گا؟ اس کے لیے صرف ونحو اور لغت میں مہارت کی بھی ضرورت ہے۔ پھر علم تفسیر وتاویل‘ اصولِ تفسیر‘ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ جیسے علوم پر جب تک انسان کی نظر نہ ہو وہ فتویٰ دینے کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علم کے بغیر اور لاعلمی کی بنیاد پر کوئی فتویٰ دے دینا درحقیقت اپنے آپ کو بڑے فتنہ میں ڈالنا ہے۔ یہ تمام احتیاطیں فتویٰ دینے کے لیے ملحوظ رکھنی ضروری ہیں‘ تبلیغ کے لیے نہیں۔ تبلیغِ قرآن کے لیے تو حضور ﷺ کی عام اجازت ہے کہ جس نے ایک آیت اچھی طرح سمجھ لی ہے‘ وہ

ایک آیت ہی پہنچائے۔ ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً)) کا ارشاد اسی عموم کو واضح کر رہا ہے۔ جس نے آگے بڑھ کر ایک سورت سمجھ لی ہے‘ وہ ایک سورت پہنچائے‘ اسے عام کرے۔ یہ عمل جب تک عوامی سطح پر نہیں ہوگا‘ ہمارے معاشرے کی اور ہمارے عوام کی قرآن مجید سے جو دُوری ہے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

یہی اعتراض لوگ کبھی ہم پر کر دیتے ہیں‘ کبھی تبلیغی جماعت والوں پر کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ درسِ قرآن یا تبلیغ دین کے لیے کھڑے کر دیے جاتے ہیں جبکہ یہ لوگ علومِ دینیہ سے واقف نہیں ہیں اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ فتویٰ نہیں دے رہے ہوتے بلکہ وہ تو لوگوں کو خیر کی تلقین کرتے ہیں‘ نصیحت کرتے ہیں‘ بھلائی کی طرف بلاتے ہیں‘ عبادتِ ربّ کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب علم بتا دے کہ فلاں بات تم نے صحیح نہیں کہی ہے تو وہ اصلاح کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج اور مضائقہ نہیں‘ بلکہ عوامی سطح پر دعوت الی القرآن اور دعوت الی الخیر اس دور کی شدید ترین ضرورت ہے اور اس کے لیے بہت بڑے پیمانے پر منظم ہو کر کام کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ لیکن حال یہ ہو گیا ہے کہ نہ خود کچھ کرو اور نہ کسی اور کو کرنے دو۔ اس کا سارا نقصان کس کا ہوگا؟ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا‘ اُمّت کے بگاڑ میں اضافہ ہوگا۔ تمہارا جو کچھ بگڑے گا وہ آخرت میں جا کر بگڑے گا۔ وہاں جو جواب دہی کرنی ہوگی اس کو سوچ لینا۔ یہ اعتراضات عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

اچھی طرح جان لیجیے کہ دعوت وتبلیغ‘ فتویٰ سے بالکل علیحدہ شے ہے۔ چنانچہ قرآن کی طرف دعوت دیجیے‘ قرآن کی تبلیغ کیجیے۔ اس کے لیے کوئی لمبے چوڑے علوم وفنون کی ضرورت نہیں۔ قرآن ناظرہ پڑھنا آتا ہے تو ناظرہ سکھاؤ‘ ترجمہ سیکھ لیا ہے تو ترجمہ سکھاؤ! اگر کچھ مزید وضاحتیں تمہارے سامنے ہیں تو ان کو عام کرو۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ کوئی شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ نہ کہے۔ آخر ہماری اُمّت میں بڑے بڑے مفکرین‘ محدثین اور مفسرین گزرے ہیں۔ پھر بحمد اللہ ہمارے اس دور میں بھی متعدد ایسے علماء عظام گزرے ہیں جنہوں نے اردو میں قرآن حکیم کی تفاسیر کا بیش بہا اور بیش قیمت سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔ کیا مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ؒ نے ساری تفاسیر کا خلاصہ اپنی تفسیر ’’معارف القرآن‘‘ میں بیان نہیں کر دیا؟ کیا صاحب ’’روح المعانی‘‘ نے عربی کی تمام تفاسیر کا عطر اپنی تفسیر میں پیش نہیں کر دیا؟ آج ہمارے

لیے کتنی سہولت ہے۔ آج ہمارے پاس صحابہ کرامؓ‘ تابعینؒ اور سلف کے مفکرین و مفسرین کے تفسیر قرآن کے ضمن میں مستند اقوال موجود ہیں۔ ان بزرگانِ دین کے حوالے سے کہو جو کچھ کہنا ہو۔ ہر پڑھے لکھے مسلمان پر‘ خواہ وہ مرد ہو یا عورت‘ لازم ہے کہ نبی اکرمﷺ کے اس فرمانِ مبارک کی تعمیل میں کہ ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً)) چراغ سے چراغ جلائے۔ ایک آیت سیکھ لی ہے‘ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اللہ توفیق دے تو عربی کی ناگزیر حد تک تحصیل کرے اور پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ کا ترجمہ اور اس پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سمجھ لے اور انہیں عام کرے۔ جو مزید گہرائی میں جانا چاہتا ہے اور فقہی مسائل کو بھی جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے وہ مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا ادریس کاندھلویؒ کی تفاسیر ’’معارف القرآن‘‘ سے استفادہ کرے۔ جدید ذہنوں تک قرآن کا پیغام اور اس کی دعوت پہنچانا مقصود ہو تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی ’’تفہیم القرآن‘‘ اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ’’تفسیر ماجدی‘‘ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کے نظام اور اس کے اندرونی نظم بالخصوص سورتوں کے باہمی ربط وضبط اور تعلق کو سمجھنے کا ذوق وشوق ہو تو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر ’’تدبر قرآن‘‘ اُس کے لیے مفید ہوگی۔

اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ کسی ایک شخص کی تفسیر آپ کے لیے کفایت نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ قرآن حکیم کے اتنے متعدد پہلو ہیں کہ سب پر بیک وقت عمیق نظر ڈالنا اور ان پر تدبر و تفکر کرنا کسی ایک شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہر شخص اپنے مزاج اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق قرآن کو دیکھتا ہے۔ مثلاً اِس وقت میرے سامنے ایک میز رکھی ہوئی ہے۔ جو حضرات دائیں طرف بیٹھے ہیں وہ ایک زاویہ سے اسے دیکھ رہے ہیں اور اس کا ایک نقشہ ان کے ذہن میں قائم ہو رہا ہے۔ جو لوگ بائیں طرف بیٹھے ہیں وہ ایک دوسرے زاویہ سے اسے دیکھ رہے ہیں‘ ان کے ذہن میں اس کی تصویر کچھ اور ہے۔ اور جو حضرات سامنے بیٹھے ہیں اور سامنے سے میز کو دیکھ رہے ہیں انہیں ایک تیسرے زاویہ سے اس کی شکل کچھ اور نظر آ رہی ہے۔ اگرچہ میز ایک ہی ہے‘ لیکن زاویہ نگاہ کے فرق کی وجہ سے کسی کو اس کا کوئی ایک حصہ زیادہ واضح طور پر نظر آ رہا ہے اور کسی کو کوئی دوسرا حصہ۔ اسی طرح قرآن مجید ایک ہی ہے لیکن جب اہلِ علم مختلف زاویوں (angles) سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی کے سامنے کوئی ایک پہلو اور کسی کے سامنے کوئی دوسرا پہلو زیادہ نمایاں ہو کر آتا ہے۔ جس شخص کے دل میں دعوت رجوع الی القرآن اور تبلیغ قرآن کا کماحقہ فریضہ

انجام دینے کا شدید داعیہ بیدار ہو اُس کا کام یہ ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو جمع کرلے۔ بہرحال حسبِ صلاحیت و استعداد کسی نہ کسی درجہ میں قرآن کو عام کرنا اور پھیلانا اور اسے دوسروں تک پہنچانا محمدٌ رسول اللہﷺ کے ہر اُمتی کا فرضِ منصبی ہے۔

الحمدللہ مَیں نے جو بات عرض کی تھی کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن مجید کے پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں ___ پہلا: ایمان وتعظیم‘ دوسرا تلاوت وترتیل‘ تیسرا تذکر وتدبر‘ چوتھا حکم واقامت اور پانچواں تبلیغ اور دعوت الی القرآن ___ بفضلہٖ تعالیٰ وعونہ مَیں نے اپنی امکانی حد تک ان کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں اس حدیث شریف کی تشریح و توضیح بیان کرنا چاہتا ہوں جو مَیں نے آغاز میں آپ حضرات کو سنائی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ نبی اکرمﷺ نے یہ ساری باتیں جامعیت کے ساتھ اس ایک حدیث میں بیان فرمادی ہیں۔

یہ حدیث حضرت عبیدہ ملیکیؓ سے مروی ہے اور اسے امام بیہقیؒ اپنی کتاب ’’شعب الایمان‘‘ میں لائے ہیں۔ یہ نبی اکرمﷺ کا ایک نوع کا خطبہ ہے۔ حضورﷺ فرماتے ہیں: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ)) ’’اے قرآن والو!‘‘ جن لوگوں نے یہ حدیث پہلے نہ سنی ہو ان کو یہ طرزِ تخاطب عجیب لگا ہوگا۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے: یَا اَھْلَ الْکِتٰبِ۔ مجھے اس اعتبار سے یہ حدیث بڑی پیاری لگتی ہے کہ نبی اکرمﷺ نے ہمیں مخاطب ہو کر فرمایا: ((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ)) ’’اے قرآن والو!‘‘ سبحان اللہ‘ کتنا پیارا خطاب ہے جو اُمتِ مُسلمہ کو ملا۔ مَیں اپنی بعض تقاریر میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لیے ’’اہل القرآن‘‘ کا نام اختیار کر لیا ہے‘ ہم نے بھی ان کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے‘ حالانکہ یہ نام انہوں نے انکارِ سُنّت و حدیث پر پردہ ڈالنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ ان کا اصل نام ہونا چاہیے ’’منکرین سُنّت اور منکرین حدیث‘‘۔ یہ ہماری بڑی نادانی ہے کہ ہم نے اُن کے اس غاصبانہ قبضے کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا‘ جبکہ حقیقت میں ’’اہل القرآن‘‘ وہ نہیں ہیں‘ ہم ہیں۔

اس حدیث شریف کے ایک ایک لفظ پر غور کیجیے۔ کتنے بلیغ ہیں یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں‘ ان کا کمال اختصار مگر جامعیت کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا

ہے۔حضورﷺ نے فرمایا:((یَا اَھْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ))''اے اہلِ قرآن! قرآن کو تکیہ مت بنا لینا''۔اس میں کتنی فصاحت و بلاغت ہے۔حضورﷺ خود فرماتے ہیں: ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ))''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''اور میں سمجھتا ہوں کہ فصاحت و بلاغت کی معراج ہے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ ((لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) کیا معنی؟ ایک تو آدمی تکیہ پر سہارا لیتا ہے' لہٰذا ایک مفہوم تو یہ ہوا کہ اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو محض ایک ذہنی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم قرآن کو ماننے والے ہیں۔ ہمارا وطیرہ ہے کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک خانہ کھول رکھا ہے اور اسے اچھے سے اچھے جزدان میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے۔ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑ جائے' چاہے وہ جھوٹی قسم ہو' تو اس کتاب اللہ کے حوالہ سے کھالی جائے اور جھوٹی شہادتوں کے لیے اس کی آڑ لے لی جائے۔ ہدایت حاصل کرنے کے لیے مطالعۂ قرآن خال خال ہی رہ گیا ہے۔ حصولِ ثواب کے لیے اس کی تلاوت کے التزام و اہتمام میں بھی روز بروز کمی آ رہی ہے اور اب تو تلاوت کا زیادہ مصرف ''ایصالِ ثواب'' ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ یا بقول علامہ اقبال' قرآن سے اتنا تعلق رہ گیا ہے کہ:

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از یٰسین اُو آساں بمیری!

(اس قرآن کی آیات سے تمہارا تعلق بس اسی قدر رہ گیا ہے کہ قریب الموت شخص کو سورۂ یٰسین سنا کر اس کی موت کو آسان بنا دیا جائے۔)

جب کہ قرآن پر ایمان سے تو بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اُن کو ادا کرنے کی فکر کریں' نہ کہ اسے محض ایک ذہنی سہارا بنا لیا جائے —— دوسرا مفہوم یہ ہوا کہ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے تو اے اہلِ قرآن' اس قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا! جیسے سورۃ البقرۃ میں یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا گیا ہے:﴿نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ ۙ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ﴾ (آیت ۱۰۱)''جن لوگوں کو (اللہ کی طرف سے) کتاب دی گئی تھی' ان میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا'' —— یعنی وہ اس سے بے نیاز اور بے پروا ہو گئے۔ تو اہل قرآن! تم ایسا ہرگز نہ کرنا —— ((لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) میں یہ دونوں مفہوم آ گئے۔

اس طرزِ عمل سے بچنا ہے تو پھر کیا کرنا ہے؟ ملاحظہ کیجیے' حضورﷺ نے آگے ارشاد فرمایا:

((وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ))''اس کو پڑھا کرو' اس کی تلاوت کیا کرو' جیسے اس کی تلاوت کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی''۔ دوسری بات کیا فرمائی:((وَاَفْشُوْہُ))''اسے پھیلاؤ' اسے عام کرو''۔ یہ لفظ کیا ہے! آپ افشائے راز استعمال کرتے ہیں۔ راز افشاء ہو گیا یعنی راز کھل گیا' راز کی بات تھی عام ہو گئی' اس کا چرچا ہو گیا۔ حضورﷺ نے وہ لفظ استعمال فرمایا:((اَفْشُوْہُ)) اس قرآن کو عام کرو' اسے پھیلاؤ' اسے دوسروں تک پہنچاؤ اور چہار دانگ عالم کو اس کے نور سے منور کر دو۔ تیسری چیز کیا فرمائی: ((وَتَغَنَّوْہُ)) —— اس کے دو معانی بیان کیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قرآن کو غنا کے ساتھ' تغنی کے ساتھ پڑھو' خوش الحانی کے ساتھ پڑھو۔ مَیں اس کے ضمن میں آپ کو دو حدیثیں سنا چکا ہوں۔ ایک یہ کہ:((زَیِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِکُمْ)) —— دوسری یہ کہ:((مَنْ لَمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَیْسَ مِنَّا)) —— اس کے دوسرے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے سے غنی ہو جاؤ' مستغنی ہو جاؤ' کسی کے سامنے اپنی احتیاج کے لیے دستِ سوال دراز نہ کرو۔ قرآن سب سے بڑی دولت ہے' اس دولت سے دامن بھر لو' اللہ تمہیں غنی کر دے گا —— آخری بات کیا فرمائی: ((وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ)) ''اور اس (قرآن) میں تدبر کرو'' —— اس کی گہرائیوں میں غور و فکر کرو' اس کے معانی کے سمندر میں غوطہ زنی کرو۔ ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' جتنی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرو گے' علوم و معارف اور عرفان کے اتنے ہی قیمتی خزینے ملیں گے۔ ((وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ))''اور قرآن میں تدبر کرو' غور و فکر کرو' تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ' بامراد ہو جاؤ' کامران ہو جاؤ' فوز و فلاح سے ہمکنار ہو جاؤ''۔ میں صمیم قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا ربّ العالمین!

اب صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے۔ مَیں نے کئی بار اپنے کتابچے کا ذکر کیا ہے جس کا عنوان ہے:''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق''۔ الحمدللہ اس کتابچے کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور یہ لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اس کے تراجم انگریزی' عربی اور فارسی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتابچے کے بارے میں اس وقت مجھے ایک خاص بات عرض کرنی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حالات کچھ اس طرح سازگار ہوئے کہ

مجھے ۱۹۷۰ء (۱۳۹۰ھ) کا پورا رمضان مدینہ منورہ میں گزارنے کی سعادت حاصل ہوگئی۔ آج بھی اس کی یادوں سے کبھی کبھی اپنے دل و دماغ کو معطر کر لیتا ہوں۔ آخری عشرے میں مولانا سیّد محمد یوسف بنوریؒ مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر رمضان میں آخری عشرے میں مسجد نبویؐ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ مَیں نے ان کی خدمت میں اپنے اس کتابچے کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ پیش کیا اور ان سے استدعا کی کہ مَیں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانا چاہتا ہوں' آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی اصلاح فرما دیں۔ میں مولانا نوراللہ مرقدہ کا بڑا احسان مند ہوں کہ انہوں نے حالت اعتکاف میں مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اسے بالاستیعاب پڑھا اور صرف ایک مقام پر اصلاح تجویز فرمائی۔ میں نے اس کے مطابق اپنے فقرہ کو بدل دیا۔ چنانچہ پہلے ایڈیشن کے بعد سے' جو بڑی محدود تعداد میں شائع ہوا' اب تک جو کتابچہ چھپتا رہا ہے اور پھیلتا رہا ہے' اس کے ایک ایک لفظ کو بحمد اللہ مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم ومغفور کی تصدیق وتصویب کی سعادت حاصل ہے۔

مَیں آپ کو دعوت دوں گا کہ مسلمانوں میں قرآن مجید' فرقانِ حمید کی طرف توجہ اور التفات پیدا کرنے کے لیے اس کتابچے کو ذریعہ بنایئے' اسے خود بغور پڑھیے اور دوسروں تک پہنچایئے۔ اس کا کوئی حق تصنیف نہ میرا محفوظ ہے' نہ انجمن خدام القرآن کا' نہ تنظیم اسلامی کا۔ اس کو کوئی فرد یا ادارہ چھاپے' مفت تقسیم کرے یا قیمتاً فروخت کرے' میری اور انجمن کی طرف سے کوئی قانونی اور اخلاقی پابندی سرے سے عائد نہیں ہے۔ میں اغلباً ۱۹۸۱ء میں جب پہلی بار دعوتی دورے پر امریکہ گیا تھا تو شکاگو میں سیاہ فام مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے' جس کے امیر وارث علی جاہ ہیں جو الحمد للہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ میں نے ان کو اس کا انگریزی ترجمہ مطالعہ کے لیے دیا تھا۔ دوسری ملاقات میں انہوں نے اس کتاب کی تحسین کی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اسے اپنی تنظیم کی طرف سے شائع کیجیے اور میرے نام کے بغیر شائع کیجیے۔ مبادا یہاں کے لوگوں کے لیے یہ بات حجاب بن جائے کہ یہ کسی پاکستانی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ میری تمنّا اور آرزو تو یہ ہے کہ یہ فکر عام ہو۔ مسلمانوں میں اعتصام اور تمسک بحبل اللہ کا جذبہ ازسرِنو بیدار ہو جائے اور وہ رسولِ خاتم ﷺ کے اس آلۂ انقلاب کو ہاتھ میں لے کر دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ میری حقیری سی توانائیاں اسی مقصد کے لیے لگ رہی

ہیں' اور اسی کے لیے مَیں امسال آپ کے شہر کراچی میں یہ رمضان گزارنے اور تراویح کے دوران دورۂ ترجمہ قرآن کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں یہ کام اپنے توشہ آخرت کے پیش نظر انجام دے رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کے اس ارشادِ گرامی پر میرا کامل ایمان ہے' جس کے راوی ہیں نبی اکرم ﷺ کے دوسرے خلیفہ راشد امیر المومنین فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور جسے امام مسلم رحمہ اللہ اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) ''اللہ تعالیٰ اس کتاب عزیز (کے اعتصام وتمسک) کی بدولت کچھ قوموں کو رفعت و سربلندی سے نوازے گا اور اس (کتاب کو ترک کرنے) کے باعث کچھ دوسری قوموں کو ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا''۔ علامہ اقبال نے ''جوابِ شکوہ'' کے ایک شعر میں اس حدیث کی بایں الفاظ ترجمانی کی ہے ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

آج پوری دنیا میں مسلمان جس انحطاط اور ذلت ونکبت سے دوچار ہیں اور ضلالت وگمراہی کے اندھیارے ہمیں جس طور پر ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لے رہے ہیں تو اس کا اصل سبب مہجوریٔ قرآن اور ترک قرآن ہی ہے۔ ورنہ نبی اکرم ﷺ تو حجۃ الوداع میں اُمّت کو پیشگی تنبیہ فرما گئے تھے کہ اس قرآن کو تھامے رہو گے تو ابدالآباد تک گمراہ نہیں ہو گے!

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا: كِتَابَ اللّٰهِ))
(صحیح مسلم)

''(مسلمانو!) مَیں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رہو گے تو تم ہرگز کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے' اور وہ چیز ہے کتاب اللہ!''

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الطُّوْر

تمہیدی کلمات

سورۃ الطور کے آغاز میں پانچ قسموں کا ذکر ہے۔ ان قسموں کے مفہوم کا تعین کرنا مشکلات القرآن میں سے ہے۔ سورۃ الطور اور سورۃ الذّاریات کے درمیان نسبتِ زوجیت اور گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں سورتوں کے آغاز کا اسلوب بھی ایک جیسا ہے۔ دونوں کے آغاز میں پے در پے قسمیں کھائی گئی ہیں اور دونوں کی قسموں کا مُقسَم علیہ بھی ایک ہے۔ سورۃ الذّاریات کی قسموں کے بعد فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ﴿۵﴾ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ﴿۶﴾﴾ جبکہ سورۃ الطور کی قسموں کے مقسم علیہ کا ذکر یوں ہوا: ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ﴿۸﴾﴾۔ اس کے بعد سورۃ الذاریات میں جنت اور دوزخ کی کیفیات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور بالکل اسی انداز سے یہ مضمون سورۃ الطور میں بھی آیا ہے۔ پھر سورۃ الذاریات کے دوسرے رکوع میں نہایت اختصار کے ساتھ انباء الرسل کا تذکرہ ہے جبکہ سورۃ الطور میں اس کے مقابل تذکیر بآلاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کی صفاتِ کاملہ کا ذکر ہے۔

آیات ۱ تا ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَ الطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّ الْبَيْتِ
الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَ السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ
عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ

السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّ تَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ
اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾
اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا
تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ
الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِيْمٍ ۙ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَ وَقٰىهُمْ
رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ
عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ
ذُرِّيَّتَهُمْ وَ مَاۤ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا
كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾ وَ اَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۲۲﴾
يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَ لَا تَاْثِيْمٌ ﴿۲۳﴾ وَ يَطُوْفُ
عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿۲۴﴾ وَ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى
بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قَالُوْۤا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْۤ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ﴿۲۶﴾
فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ
نَدْعُوْهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ﴿۲۸﴾

آیت ۱ ﴿وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾﴾ ’’قسم ہے طور کی۔‘‘

طور عام پہاڑ کو بھی کہا جاتا ہے‘ لیکن ’’الطُّور‘‘ سے مراد وہ خاص پہاڑ (طورِ سینین)(۱) ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔

آیت ۲ ﴿وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾﴾ ’’اور اُس کتاب کی قسم جو لکھی ہوئی ہے۔‘‘

اس بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ اس سے مراد تورات ہے‘ کیونکہ تورات پتھر کی

۱۔ اس کا تذکرہ سورۃ التّین میں بایں الفاظ ہوا ہے: ﴿وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ﴿۲﴾﴾ ’’اور قسم ہے طورِ سینین کی!‘‘

تختیوں پر لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی' جبکہ قرآن قلبِ محمد ﷺ پر براہِ راست نازل ہوا تھا۔

آیت ۳ ﴿فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝۳﴾ ''کشادہ ورق میں۔''

یعنی وہ تختیاں خوب کشادہ تھیں جن پر تورات کی عبارت تحریر تھی۔ گویا یہ تین قسمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات سے متعلق ہیں۔ کوہِ طور پر آپؑ کو مکالمۂ الٰہی سے سرفراز فرمایا گیا اور آپؑ کو ایک ایسی کتاب عطا کی گئی جو کشادہ تختیوں پر لکھی ہوئی تھی۔

آیت ۴ ﴿وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝۴﴾ ''اور قسم ہے آباد گھر کی۔''

''اَلْبَیْتِ الْمَعْمُوْر'' سے بعض مفسرین بیت اللہ مراد لیتے ہیں کہ اس میں طواف اور عبادت کے لیے ہر وقت لوگ موجود رہتے ہیں۔ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں اس سے مراد خانہ کعبہ کے عین اوپر ساتویں آسمان میں فرشتوں کا کعبہ ہے جو ہر وقت ''معمور' رہتا ہے' جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ بعض مفسرین کی رائے میں اس سے دنیا مراد ہے جو طرح طرح کی مخلوق سے معمور ہے اور مجھے ذاتی طور پر اس رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ بعد والی قسم اسی مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے۔

آیت ۵ ﴿وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۝۵﴾ ''اور قسم ہے اونچی چھت کی۔''

اس سے آسمان مراد ہے۔ پچھلی آیت کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ دنیا ایک گھر کی مانند ہے جس میں انسان آباد ہیں اور آسمان اس گھر کی چھت ہے۔

آیت ۶ ﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۝۶﴾ ''اور قسم ہے اُبلتے ہوئے سمندر کی۔''

اس سے سمندر کی وہ کیفیت مراد ہے جسے ہم اپنی زبان میں 'موج زن سمندر' یا ''ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر'' کہہ کر بیان کرتے ہیں۔ سمندر کو دیکھنے سے واقعتاً ایسے محسوس بھی ہوتا ہے جیسے یہ جوش سے اُبل رہا ہے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے ان قسموں کے معانی و مفاہیم کے بارے میں مفسرین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ البتہ ان قسموں کا مُقسَم علیہ وہی ہے جو کہ سورۃ الذاریات کی قسموں کا مقسم علیہ ہے۔

آیت ۷ ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝۷﴾ ''آپؐ کے ربّ کا عذاب یقیناً واقع ہو کر رہے گا۔''

اس سے قیامت کا سخت دن مراد ہے جس کے اٹل ہونے کی حقیقت کو سورۃ الشوریٰ کی

آیت ۴۷ میں ﴿یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ﴾ ''وہ دن جسے لوٹایا نہ جا سکے گا'' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۸ ﴿مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝۸﴾ ''اسے کوئی روکنے والا نہ ہوگا۔''

آیت ۹ ﴿یَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝۹﴾ ''جس روز کہ آسمان بُری طرح لرزے گا۔''

آیت ۱۰ ﴿وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا ۝۱۰﴾ ''اور پہاڑ چل رہے ہوں گے جیسے چلا جاتا ہے۔''

پہاڑوں پر زمین کی گرفت برقرار نہیں رہے گی اور وہ ٹوٹ کر فضا میں بادلوں کی طرح اُڑتے پھریں گے۔

آیت ۱۱ ﴿فَوَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝۱۱﴾ ''پس ہلاکت و بربادی ہے اُس دن جھٹلانے والوں کے لیے۔''

آیت ۱۲ ﴿الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ ۝۱۲﴾ ''وہ لوگ جو خوش گپیوں میں مصروف کھیل رہے ہیں۔''

آیت ۱۳ ﴿یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ۝۱۳﴾ ''جس دن ان کو دھکے دے دے کر جہنّم کی طرف دھکیلا جائے گا۔''

آیت ۱۴ ﴿هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ۝۱۴﴾ ''(اور کہا جائے گا:) یہ ہے وہ آگ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔''

آیت ۱۵ ﴿اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۝۱۵﴾ ''کیا یہ جادو ہے یا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟''

اب بتاؤ! کیا تم اپنے سامنے واقعی جہنّم کو دیکھ رہے ہو یا اس کو بھی تم جادو کا کھیل ہی سمجھتے ہو؟

آیت ۱۶ ﴿اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ ۭ﴾ ''اب داخل ہو جاؤ اس میں' تم خواہ صبر کرو یا نہ کرو' اب تمہارے حق میں برابر ہے۔''

اب تمہارے جزع فزع کرنے اور چیخنے چِلّانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اب یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ تمہارے پاس اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس میں خاموشی سے داخل ہو جاؤ اور اس کی سختیوں کو صبر سے برداشت کرو۔

﴿اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۱۶﴾ ''تمہیں بدلے میں وہی کچھ تو مل رہا ہے

جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے۔“

آیت ۱۷ ﴿اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیۡمٍ ﴿۱۷﴾﴾ ”یقیناً متقی لوگ باغات اور نعمتوں میں ہوں گے۔“

آیت ۱۸ ﴿فٰکِہِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰہُمۡ رَبُّہُمۡ ۚ﴾ ”وہ مزے کر رہے ہوں گے ان نعمتوں کے ساتھ جو اُن کے ربّ نے انہیں عطا کی ہوں گی۔“

﴿وَ وَقٰہُمۡ رَبُّہُمۡ عَذَابَ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۸﴾﴾ ”اور بچا لے گا انہیں ان کا ربّ جہنّم کے عذاب سے۔“

آیت ۱۹ ﴿کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا ہَنِیۡٓئًۢا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۹﴾﴾ ”اور کھاؤ پیو رچتا پچتا اُن اعمال کا صلہ جو تم کرتے رہے ہو۔“

قبل ازیں بھی متعدد مرتبہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ جنّت کی قدر افزائی کے لیے جنّت اور اس کی نعمتوں کو ان کے اعمال کا صلہ قرار دیا جائے گا‘ جبکہ اہلِ جنّت بار بار یہ اقرار کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! یہ تیرا فضل ہے جو تُو نے ہمیں بخش دیا اور جنّت کی نعمتوں سے سرفراز فرمایا‘ ورنہ ہم اس قابل ہرگز نہ تھے۔

آیت ۲۰ ﴿مُتَّکِـِٕیۡنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصۡفُوۡفَۃٍ ۚ﴾ ”وہ تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے ان تختوں پر جو برابر بچھے ہوں گے صف در صف۔“

﴿وَ زَوَّجۡنٰہُمۡ بِحُوۡرٍ عِیۡنٍ ﴿۲۰﴾﴾ ”اور انہیں ہم بیاہ دیں گے بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کے ساتھ۔“

آیت ۲۱ ﴿وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ اتَّبَعَتۡہُمۡ ذُرِّیَّتُہُمۡ بِاِیۡمَانٍ اَلۡحَقۡنَا بِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ﴾ ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور اُن کی اولاد نے بھی ان کی پیروی کی ایمان کے ساتھ‘ ہم ملا دیں گے ان کے ساتھ ان کی اس اولاد کو“

قبل ازیں اس مضمون کا ذکر سورۃ المؤمن میں حاملینِ عرش اور ان کے ساتھی فرشتوں کی دعا کے ضمن میں بھی آ چکا ہے۔ وہ اللہ کے حضور مؤمنین کے لیے یوں دعا کر رہے ہوں گے: ﴿رَبَّنَا وَ اَدۡخِلۡہُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ۣالَّتِیۡ وَعَدۡتَّہُمۡ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ اٰبَآئِہِمۡ وَ اَزۡوَاجِہِمۡ وَ ذُرِّیّٰتِہِمۡ ؕ

اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۸﴾﴾ ”اے ہمارے پروردگار! انہیں داخل فرما اُن رہنے والے باغات میں جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور (ان کو بھی) جو نیک ہوں ان کے آباء واَجداد‘ ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے۔ تُو یقیناً زبردست ہے‘ کمالِ حکمت والا ہے“۔ اب زیر مطالعہ آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے اس کریمانہ فیصلے کا خود اعلان فرما رہے ہیں کہ ہم اہلِ جنّت کی اولاد کو اُن کے ساتھ ملا دیں گے۔ یعنی نچلے درجے کی جنّت کے مستحق افراد کو بھی ان کے والدین کے برابر لے آئیں گے جو اعلیٰ درجات کی جنّتوں میں متمکّن ہوں گے۔

﴿وَ مَاۤ اَلَتۡنٰہُمۡ مِّنۡ عَمَلِہِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ﴾ ”اور ہم اُن کے عمل میں سے کوئی کمی نہیں کریں گے۔“

یعنی اگر کوئی شخص اعلیٰ درجے کی جنّت میں ہے اور اس کے اہل وعیال نسبتاً نچلے درجے میں ہیں تو یہ نہیں ہوگا کہ اس شخص کو اس کے اہل وعیال کے پاس نچلے درجے میں بھیج دیا جائے بلکہ اس کے اہل وعیال کے درجات بلند کر کے اس کے برابر کر دیا جائے گا۔ گویا اہلِ جنّت کے اکرام کے لیے یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہوگا کہ ان کے رشتے داروں میں سے جو کوئی کم درجے کی جنّت کا بھی مستحق ہو جائے گا اسے ترقی دے کر ان کے اعلیٰ جنّتوں والے رشتے داروں سے ملا دیا جائے گا تاکہ انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب ہو۔

﴿کُلُّ امۡرِیًٔۢ بِمَا کَسَبَ رَہِیۡنٌ ﴿۲۱﴾﴾ ”ہر انسان اپنی کمائی کے عوض رہن ہوگا۔“

آیت ۲۲ ﴿وَ اَمۡدَدۡنٰہُمۡ بِفَاکِہَۃٍ وَّ لَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ﴿۲۲﴾﴾ ”اور ہم انہیں دیے چلے جائیں گے پھل اور گوشت جس سے وہ چاہیں گے۔“

آیت ۲۳ ﴿یَتَنَازَعُوۡنَ فِیۡہَا کَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِیۡہَا وَ لَا تَاۡثِیۡمٌ ﴿۲۳﴾﴾ ”اس میں وہ ایک دوسرے سے چھین رہے ہوں گے وہ جام جن (کے مشروب) میں نہ تو کوئی بے ہودگی ہوگی اور نہ ہی گناہ میں ڈالنے والی کوئی بات۔“

یہ اہلِ جنّت کی دوستانہ محفلوں کی رونق اور چہل پہل کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے کہ وہ خوش طبعی کے انداز میں ایک دوسرے سے جام چھین رہے ہوں گے۔ اہلِ جنّت کو جو مشروب ملے گا اس میں کیف وسرور تو ہوگا لیکن دنیا کی شراب کی طرح بے ہودگی کی کوئی کیفیت نہیں ہوگی۔

آیت ۲۴ ﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ ۲۴﴾ ''اور اُن پر گردش میں رہیں گے نوجوان لڑکے ان کی خدمت کے لیے' وہ ایسے ہوں گے جیسے موتی ہوں غلافوں میں رکھے ہوئے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ۲۵﴾ ''اور وہ (اہلِ جنّت) ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے باہم سوال کریں گے۔''

آیت ۲۶ ﴿قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ۲۶﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہم پہلے اپنے اہل وعیال میں ڈرتے ہوئے رہتے تھے۔''

دنیا میں اپنے اہل وعیال اور عزیز واقارب کے درمیان معمول کی زندگی بسر کرتے ہوئے ہمیں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں شرفِ قبولیت حاصل کر بھی پائیں گے یا نہیں۔ نہ معلوم نیک اعمال کی قبولیت کے لیے مطلوبہ معیار کا اخلاص ہمارے دلوں میں ہے بھی یا نہیں۔ کہیں ہم سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو جائے جو ہماری ساری محنت کو بھی اکارت کر دے۔ ایسے اندیشے اور خدشے ہر لحظہ ہمیں دامن گیر رہتے تھے۔

آیت ۲۷ ﴿فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ ۲۷﴾ ''تو اللہ نے بڑا احسان کیا ہم پر اور ہمیں بچا لیا لُو کے عذاب سے۔''

آیت ۲۸ ﴿إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ﴾ ''یقیناً ہم پہلے سے اُس کو پکارا کرتے تھے۔''

البتہ یہ ضرور تھا کہ اپنی دنیوی زندگی میں ہم اپنی مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے مسلسل دعائیں کرتے رہتے تھے۔

﴿إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ۲۸﴾ ''یقیناً وہ بہت ہی اچھا سلوک کرنے والا' بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۲۹ تا ۴۹

فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۲۹ أَمْ
يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ۳۰ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي

مَعَكُم مِّنَ الْمُتَرَبِّصِينَ ۳۱ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا ۚ أَمْ هُمْ
قَوْمٌ طَاغُونَ ۳۲ أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ ۚ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ۳۳
فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ۳۴ أَمْ خُلِقُوا مِنْ
غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۳۵ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَ
الْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ ۳۶ أَمْ عِندَهُمْ خَزَائِنُ رَبِّكَ أَمْ
هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ ۳۷ أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ ۖ فَلْيَأْتِ
مُسْتَمِعُهُم بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۳۸ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمُ الْبَنُونَ ۳۹ أَمْ
تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُم مِّن مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ۴۰ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ
فَهُمْ يَكْتُبُونَ ۴۱ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ
الْمَكِيدُونَ ۴۲ أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا
يُشْرِكُونَ ۴۳ وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ
مَّرْكُومٌ ۴۴ فَذَرْهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ
يُصْعَقُونَ ۴۵ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ
يُنصَرُونَ ۴۶ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَٰلِكَ وَلَٰكِنَّ
أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۴۷ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ۖ وَ
سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۴۸ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ
إِدْبَارَ النُّجُومِ ۴۹

آیت ۲۹ ﴿فَذَكِّرْ فَمَا أَنتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ ۲۹﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ تذکیر کرتے رہیے' پس آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔''

یہ خطاب اگرچہ حضور ﷺ سے ہے لیکن اصل میں سنانا ان لوگوں کو مقصود ہے جو آپ کے ایسے نام رکھتے تھے۔ ان لوگوں کو نظر انداز کر کے حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ان کی فضول باتوں پر بالکل توجہ نہ دیں اور لوگوں کو مسلسل تذکیر اور یاددہانی کرتے رہیں۔ اس سے ملتا جلتا مضمون قبل ازیں گزشتہ سورت (الذاریات) میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں فرمایا گیا

تھا: ﴿فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ ﴿۵۴﴾ وَّ ذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۵۵﴾﴾
’’پس (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے رخ پھیر لیں‘ آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور آپ تذکیر کرتے رہیے‘ کیونکہ یہ تذکیر اہلِ ایمان کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔‘‘

آپؐ تذکیر و تبلیغ کا عمل مسلسل جاری رکھیے۔ کیا خبر کسی دل میں ایمان کی کوئی کلی کھلنے والی ہو‘ کیا خبر آپؐ کے کسی دشمن کا دل بھی موم ہونے والا ہو۔ حضرت عمر فاروق ؓ کے ایمان لانے کا واقعہ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ تذکیر آہستہ آہستہ دلوں کو متاثر کرتی رہتی ہے اور پھر کسی وقت اچانک وہ گھڑی آپہنچتی ہے جب دل میں ایمان کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ حضرت عمر ؓ اگرچہ حضور ﷺ کی مخالفت میں ہر وقت پیش پیش رہتے تھے لیکن چونکہ سخن شناس تھے اس لیے کلامِ الٰہی سننے کے لیے متجسس بھی رہتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ رات کو صحنِ کعبہ میں قیام اللیل کے دوران قرآن مجید کی تلاوت فرمایا کرتے تو کبھی کبھی حضرت عمرؓ چھپ کر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے تلاوت سنتے اور کلامِ الٰہی کی تاثیر کو اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کرتے تھے۔ گویا حضور ﷺ کی تذکیر اور قرآن کی تاثیر تدریجاً ان کے دل میں گھر کر رہی تھی۔ اسی تدریجی عمل کے باعث آپؓ کے خیالات و جذبات میں اندر ہی اندر ایک مثبت تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ اُس کے بعد مشیتِ الٰہی سے وہ واقعہ رونما ہوا جس کے باعث اس خاموش تبدیلی کو اظہار کا موقع ملا اور آپؓ کو ایمان کی دولت نصیب ہوگئی۔ اُس دن تو آپؓ گھر سے حضور ﷺ کو قتل کرنے کی نیت سے نکلے تھے۔ راستے میں اپنی بہن فاطمہؓ بنت خطاب اور اپنے بہنوئی حضرت سعیدؓ بن زید سے اُلجھ پڑے۔ آپؓ کے تشدد کا سامنا کرتے ہوئے بہن نے جب ڈٹ کر کہا کہ عمر تم جو چاہے کر لو اب ہم اپنے دین کو چھوڑنے والے نہیں! تو آپؓ اپنی بہن کے اس غیر معمولی عزم اور حوصلے کے سامنے ڈھیر ہوگئے۔ پھر کیا تھا‘ آپؓ کے دل کا ’’بند‘‘ یکدم کھل گیا اور آپؓ نے حق کو اعلانیہ قبول کر لیا۔

آیت ۳۰ ﴿اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيۡبَ الۡمَنُوۡنِ ﴿۳۰﴾﴾ ’’کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک شاعر ہے‘ جس کے لیے ہم منتظر ہیں گردشِ زمانہ کے؟‘‘

مشرکینِ مکہ آپس میں ایک دوسرے کو یہ کہہ کر تسلی دیتے تھے کہ محمد (ﷺ) محض ایک شاعر ہیں۔ ان کے شاعرانہ کلام سے متاثر ہونے میں جلدی مت کرو‘ کچھ دیر انتظار کرو گے

(wait and see!)‘ تو ان کے دعووں کی اصل حقیقت خود بخود کھل کر سامنے آجائے گی۔ ہمیں قوی اُمید ہے کہ بہت جلد یہ خود ہی گردشِ زمانہ کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

آیت ۳۱ ﴿قُلۡ تَرَبَّصُوۡا فَاِنِّىۡ مَعَكُمۡ مِّنَ الۡمُتَرَبِّصِيۡنَ ﴿۳۱﴾﴾ ’’آپؐ کہیے کہ اچھا تم انتظار کرو‘ مَیں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ ﴿۳۲﴾﴾ ’’کیا ان کی عقلیں انہیں یہی کچھ سکھا رہی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ؟‘‘

مشرکین کے ایمان نہ لانے کی یہ دو ہی ممکنہ وجوہات تھیں۔ یا تو واقعتاً انہیں بات سمجھ نہیں آرہی تھی اور ان کی عقلیں انہیں یہی سکھاتی تھیں کہ محمد (ﷺ) جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ محض شاعری اور ان کا مَن گھڑت کلام ہے۔ دوسرا امکان یہ تھا کہ بات ان کی سمجھ میں بھی آتی تھی اور ان کے دل گواہی بھی دیتے تھے کہ یہ سب کچھ درست ہے مگر وہ اپنی سرکشی‘ ضد اور عناد کی وجہ سے انکار پر جمے رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت میں یہ ساری باتیں وہ عقل سے نہیں بلکہ سراسر ضد‘ عناد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کر رہے تھے۔ دراصل نفسِ انسانی کی سرکشی بھی دریا کی طغیانی کی طرح ہے جس کے سامنے منطق‘ تدبیر‘ کوشش وغیرہ کسی کی نہیں چلتی۔ بقول الطاف حسین حالی: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

آیت ۳۳ ﴿اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ﴾ ’’کیا ان کا کہنا ہے کہ یہ اس (محمد ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟‘‘

تَقَوَّلَ باب تفعّل سے ہے اور اس کے معنی تکلّف کر کے کچھ کہنے کے ہیں‘ یعنی قرآن کے بارے میں مشرکین کا یہ کہنا تھا کہ محمد (ﷺ) محنت و ریاضت کے ذریعے یہ کلام خود ’’موزوں‘‘ کرتے ہیں۔

﴿بَلۡ لَّا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۳﴾﴾ ’’بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ ماننے والے نہیں ہیں۔‘‘

آیت ۳۴ ﴿فَلۡيَاۡتُوۡا بِحَدِيۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ ’’تو وہ لے آئیں اس

جیسی کوئی ایک بات اگر وہ سچے ہیں۔''

یہ وہ چیلنج ہے جو قرآن نے بار بار انہیں دیا کہ اگر تم واقعتاً یہ سمجھتے ہو کہ یہ کلام محمد (ﷺ) کا اپنا بنایا ہوا ہے تو ایسا ہی کلام تم بھی اس کے مقابلے میں بنا کر لے آؤ۔ آخر تمہارے درمیان بڑے بڑے خطباء‘ ادباء اور شعراء موجود ہیں‘ ان سب کو اکٹھا کرو اور کوشش کر کے دیکھ لو۔

آیت ۳۵ ﴿اَمۡ خُلِقُوۡا مِنۡ غَیۡرِ شَیۡءٍ اَمۡ هُمُ الۡخٰلِقُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''کیا یہ بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بن گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں؟''

یہ فلسفے کا بہت گہرا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کوئی شے بغیر کسی کے بنائے ہوئے خود بخود تو بنتی نہیں ہے۔ چنانچہ کسی بھی چیز کی تخلیق کے حوالے سے دو ہی صورتیں ممکن ہیں‘ یعنی یا تو اس چیز کو کسی نے تخلیق کیا ہے یا اس چیز نے اپنے آپ کو خود تخلیق کیا ہے۔ چنانچہ یہ منطقی سوال ان کے سامنے رکھا گیا کہ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ تم نے خود اپنے آپ کو تخلیق نہیں کیا تو پھر خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ کسی دوسری ہستی نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہستی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیت ۳۶ ﴿اَمۡ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ ۚ بَلۡ لَّا یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾ ''کیا آسمانوں اور زمین کو انہوں نے بنایا ہے؟ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) یہ یقین نہیں رکھتے۔''

چلو اپنی تخلیق کی بحث کو چھوڑو‘ تم ذرا یہ بتاؤ کہ زمین و آسمان تم نے بنائے ہیں؟ اگر تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے نہیں بنائے تو پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ خود تمہارا خالق اور تمام مخلوق سمیت پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جو دو اور دو چار کی طرح مسلّم ہیں‘ لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ یقین سے محروم ہیں۔

آیت ۳۷ ﴿اَمۡ عِنۡدَهُمۡ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمۡ هُمُ الۡمُصَۜیۡطِرُوۡنَ ﴿۳۷﴾﴾ ''کیا ان کے قبضہ قدرت میں آپؐ کے ربّ کے خزانے ہیں یا یہ داروغہ ہیں؟''

اس آیت کو پڑھتے ہوئے مشرکینِ مکّہ کا وہ اعتراض بھی ذہن میں تازہ کر لیں جس کا ذکر سورۃ الزخرف کی آیت ۳۱ میں ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر وحی بھیجنا تھی اور اپنا کلام دنیا میں نازل کرنا ہی تھا تو اس کے لیے اُس کی نظر بنو ہاشم کے ایک یتیم شخص ہی پر کیوں پڑی‘ جو نہ تو سرمایہ دار ہے اور نہ ہی مکّہ کے قبائلی نظام کے اعلیٰ عہدوں (hierarchy) میں سے کوئی عہدہ اس کے پاس ہے!

عرب کے قبائلی معاشرے میں کسی شخصیت کے ''بڑے'' ہونے کا ایک معیار یہ بھی تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے پر فائز ہو۔ جیسے حضرت ابوبکر صِدّیق ؓ اُس زمانے میں مقدماتِ قتل کے فیصلے کرنے پر مامور تھے۔ یہ قبائلی نظام کا بہت بڑا اور انتہائی حساس نوعیت کا عہدہ تھا جس پر حضرت ابوبکرؓ اس زمانے میں فائز تھے۔ اس کے علاوہ آپؓ بہت بڑے تاجر اور سرمایہ دار بھی تھے۔ اُس زمانے میں حضرت ابوبکر صِدّیق ؓ کے سرمائے کی مالیت چالیس ہزار درہم کے لگ بھگ تھی۔ اس حوالے سے یہ حقیقت بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد آپؓ نے یہ سارا سرمایہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں لٹا دیا اور جب آپؓ ہجرت کے لیے مدینہ روانہ ہوئے تو پیچھے گھر والوں کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔

بہرحال مشرکینِ مکّہ بار بار یہ اعتراض کرتے تھے کہ آخر اللہ تعالیٰ نے اس منصب کے لیے ان دو بڑے شہروں (مکّہ اور طائف) میں سے کسی بڑی شخصیت کو کیوں منتخب نہیں کیا: ﴿وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ ﴿۳۱﴾﴾ (الزخرف) ''اور کہنے لگے کہ کیوں نہیں اتارا گیا یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم شخص پر؟'' اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿اَهُمۡ یَقۡسِمُوۡنَ رَحۡمَتَ رَبِّكَ ؕ﴾ (الزخرف:۳۲) ''کیا آپ کے رب کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کریں گے؟'' آیت زیر مطالعہ میں بھی حضور ﷺ کے خلاف اسی نوعیت کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے خزانے کیا ان لوگوں کے قبضہ قدرت میں ہیں؟ اور کیا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے فیصلے کرنے میں ان لوگوں کی مرضی ومنشا کا پابند ہے؟

آیت ۳۸ ﴿اَمۡ لَهُمۡ سُلَّمٌ یَّسۡتَمِعُوۡنَ فِیۡهِ ۚ﴾ ''کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کے ذریعے سے یہ آسمان کی خبریں سن لیتے ہیں؟''

﴿فَلۡیَاۡتِ مُسۡتَمِعُهُمۡ بِسُلۡطٰنٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۸﴾﴾ ''(اگر ایسا ہے) تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل لائے۔''

آیت ۳۹ ﴿اَمۡ لَهُ الۡبَنٰتُ وَ لَكُمُ الۡبَنُوۡنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''کیا اُس کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے؟''

آیت ۴۰ ﴿اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ ''کیا آپ ان لوگوں سے کوئی اجرت طلب کر رہے ہیں کہ یہ تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں؟''

یہاں پر پے در پے سوالات کا انداز خصوصی تاثیر کا حامل ہے۔ یہ مقام زورِ خطابت‘ فصاحت‘ بلاغت‘ ادبیت اور عذوبت کے حوالے سے گویا قرآن مجید کی معراج ہے۔ ظاہر بات ہے ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔

آیت ۴۱ ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾﴾ ''کیا ان کے پاس غیب کا علم ہے جسے یہ لکھ رہے ہیں؟''

آیت ۴۲ ﴿اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۭ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''کیا یہ لوگ کوئی چال چلنا چاہتے ہیں؟ اصل میں تو یہ کافر خود ہی چال کا شکار ہو گئے ہیں۔''

یہ لوگ ایک منصوبہ بندی کے تحت ہمارے رسول ﷺ اور قرآن کے خلاف جھوٹی باتیں پھیلا رہے ہیں تاکہ عوام ان سے متاثر نہ ہوں۔ لیکن ان کی یہ باتیں اس قدر بودی ہیں کہ خود ان کے اپنے دل بھی ان کو نہیں مانتے۔ ان کی سازشوں کو اللہ تعالیٰ اسی طرح ناکام کرتا رہتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ الطارق میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ﴿۱۶﴾﴾ ''یہ لوگ تو اپنی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں اور مَیں اپنی تدبیر کر رہا ہوں۔''

آیت ۴۳ ﴿اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾﴾ ''کیا ان کے لیے اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟ پاک ہے اللہ اس سے جو شرک یہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۴۴ ﴿وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاۗءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور اگر کبھی یہ دیکھیں آسمان کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا تو کہیں گے کہ یہ تو بادل ہیں تہ بر تہ۔''

ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا بھی عذابِ الٰہی بن کر ان پر گر رہا ہو تو اسے بھی یہ لوگ بارش برسانے والا بادل ہی سمجھیں گے۔ جیسا کہ قوم عاد کے لوگوں نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے عذاب کو دیکھ کر کہا تھا: ﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾ (الاحقاف:۲۴) ''یہ تو بادل ہے جو ہم کو سیراب کرنے والا ہے''۔ یہ بادل برسیں گے تو ہمارے علاقے میں جل تھل کر دیں گے۔

آیت ۴۵ ﴿فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''تو (اے

نبی ﷺ!) چھوڑے رکھیے ان کو‘ یہاں تک کہ وہ اپنے اُس دن سے دوچار ہوں جس میں ان پر بجلی کی کڑک گرے گی۔''

''چھوڑ دینے'' کے مفہوم میں یہ حکم ابتدائی زمانے کی سورتوں میں تکرار کے ساتھ آیا ہے۔ جیسے سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''تو (اے پیغمبر ﷺ!) ان کو باطل میں پڑے رہنے اور کھیل لینے دو یہاں تک کہ جس دن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ان کے سامنے آ موجود ہو''۔ سورۃ القلم میں فرمایا گیا: ﴿فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''تو آپ مجھ کو اس کلام کے جھٹلانے والوں سے سمجھ لینے دیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ ایسے طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی''۔ اس حکم کے تکرار کا مطلب یہی ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ان لوگوں کے تمسخر‘ استہزاء اور دیگر مخالفانہ ہتھکنڈوں کو بالکل خاطر میں نہ لائیں اور تبلیغ و تذکیر کے حوالے سے اپنا مشن جاری رکھیں۔ ان لوگوں کے معاملے کو آپؐ مجھ پر چھوڑ دیں‘ ان سے مَیں خود نمٹ لوں گا۔

آیت ۴۶ ﴿يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''جس دن ان کی چالیں ان کے کسی کام نہ آ سکیں گی اور نہ ہی ان کی کوئی مدد ہی ہو گی۔''

ان کی ساری چالیں ناکام ہو جائیں گی اور کوئی مددگار ان کی مدد کو نہ پہنچ سکے گا۔

آیت ۴۷ ﴿وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ ''اور ان ظالموں کے لیے اُس (آخرت کے عذاب) کے علاوہ بھی ایک عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت علم نہیں رکھتی۔''

اس عذاب سے یا تو قحطِ مکّہ کا عذاب مراد ہے جس کا ذکر سورۃ الدخان میں ہے اور یا پھر غزوۂ بدر کے دن کا عذاب جس دن مکّہ کے ستر سردار مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔

آیت ۴۸ ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ ''(اور اے نبی ﷺ) آپ اپنے ربّ کے فیصلے کا انتظار کیجیے۔''

ابتدائی مکّی دور کی سورتوں میں یہ حکم بار بار آیا ہے۔ خصوصاً زیر مطالعہ گروپ کی سورتوں اور

۲۹ویں پارے کی سورتوں میں تو فَاصۡبِرۡ یا وَاصۡبِرۡ کے صیغے کی بہت تکرار ملتی ہے۔ سورۃ النحل میں فرمایا گیا: ﴿وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (آیت ۱۲۷) ''آپ صبر کیجیے اور آپ کا صبر تو اللہ ہی کے سہارے پر ہے''۔ سورۃ الاحقاف میں حضورﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (آیت ۳۵) ''پس آپ بھی صبر کیجیے جیسے ہمارے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا تھا''۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نوسو سال تک اپنی قوم کی زیادتیاں برداشت کیں۔ سورۃ المزمل میں ارشاد ہوا: ﴿وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ﴾ (آیت ۱۰) ''اور اس پر صبر کیجیے جو یہ لوگ آپ کے خلاف باتیں بنا رہے ہیں''۔ سورۃ المدثر میں فرمایا گیا: ﴿وَلِرَبِّكَ فَاصۡبِرۡ ۷﴾ ''اور آپ اپنے رب کے لیے صبر کریں''۔ غرض ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں رسول اللہﷺ کو براہِ راست مخاطب کر کے بار بار ہدایت کی جاتی رہی کہ آپﷺ صبر کا دامن مضبوطی سے تھامے رہیں۔ عربی میں ''صبر'' کے بعد اگر ''ل'' آجائے، جیسے کہ آیت زیر مطالعہ میں ہے، تو اس کے معنی انتظار کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ اسی مفہوم کے پیش نظر کیا گیا ہے۔

﴿فَاِنَّكَ بِاَعۡیُنِنَا﴾ ''بے شک آپ ہماری نگاہوں میں ہیں''۔

آپﷺ مسلسل ہماری نظروں کے سامنے ہیں، ہم آپ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ ہم آپ کی نگہبانی کر رہے ہیں، آپ کو آپ کے حال پر نہیں چھوڑ دیا۔ بالکل یہی مضمون سورۂ یونس کی آیت ۶۱ میں بھی آیا ہے:

﴿وَمَا تَكُوۡنُ فِیۡ شَاۡنٍ وَّمَا تَتۡلُوۡا مِنۡهُ مِنۡ قُرۡاٰنٍ وَّلَا تَعۡمَلُوۡنَ مِنۡ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیۡكُمۡ شُهُوۡدًا اِذۡ تُفِیۡضُوۡنَ فِیۡهِ ؕ﴾

''اور (اے نبیﷺ!) نہیں ہوتے آپ کسی بھی کیفیت میں اور نہیں پڑھ رہے ہوتے آپ قرآن میں سے کچھ، اور (اے مسلمانو!) تم نہیں کر رہے ہوتے کوئی بھی (اچھا) عمل مگر یہ کہ ہم تمہارے پاس موجود ہوتے ہیں جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو۔''

﴿وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ حِیۡنَ تَقُوۡمُ ۴۸﴾ ''اور آپ (ﷺ) تسبیح کرتے رہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ جب آپ کھڑے ہوں۔''

اس بارے میں عام رائے یہی ہے کہ یہ حضورﷺ کی تہجد کی نماز کی طرف اشارہ ہے

کیونکہ آغاز میں تو وہی ایک نماز تھی۔ جیسا کہ سورۃ المزمل کی ان آیات میں قیام اللیل کا ذکر ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۱ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۲ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِیۡلًا ۳ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ۴﴾

''اے کپڑا اوڑھنے والے! رات کو قیام کیا کرو مگر (ساری رات نہیں بلکہ) کم۔ (یعنی) نصف رات یا اس سے کچھ کم کر لو۔ یا اس پر کچھ زیادہ کر لو اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

آیت ۴۹ ﴿وَمِنَ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡهُ﴾ ''اور رات کے ایک حصے میں بھی آپ اُس کی تسبیح کریں''

گویا تہجد کے علاوہ بھی رات کے مختلف حصوں میں حضورﷺ کو تسبیح وتحمید کرنے کی ہدایت کی جا رہی ہے۔ ابتدائی دور کی ان سورتوں میں جن اوقات کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے مخصوص کرنے کے احکام دیے گئے ہیں، بعد میں جب پانچ اوقات کی نماز فرض ہوئی تو وہی اوقات مختلف نمازوں کے اوقات قرار پائے۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق مغرب اور عشاء کی نمازیں فرض ہوئیں، کیونکہ غروبِ آفتاب سے رات شروع ہوجاتی ہے اور عشاء کی نماز بھی رات کے ایک حصے میں ہی ادا کی جاتی ہے۔

﴿وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ ۴۹﴾ ''اور ستاروں کے پیٹھ موڑتے وقت بھی (آپ تسبیح کیجیے)۔''

جب ستاروں کا قافلہ کوچ کرتا ہے تو صبح کی آمد آمد ہوتی ہے۔ اس سے صبح صادق کا وقت مراد ہے اور بعد میں اس وقت پر نمازِ فجر فرض ہوئی۔

۞۞۞

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں، آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

انجمن کے بعد تنظیم کیوں؟

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

(جولائی ۱۹۷۴ء میں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے اپنی جس تقریر میں تنظیم اسلامی کے قیام کا اعلان کیا اور جو اب ’’عزمِ تنظیم‘‘ کے نام سے طبع ہوتی ہے وہ اواخر ۱۹۷۴ء میں ’’میثاق‘‘ میں بانی محترمؒ کی اس تحریر کے ساتھ شائع ہوئی جو اب ’’تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘‘ کے عنوان سے طبع ہوتی ہے ___ اس پر ایک مخلص کرم فرما کی جانب سے ایک مفصل خط موصول ہوا کہ اس سے کرنے کا وہ ’’اصل کام‘‘ رہ جائے گا جس کا تذکرہ ’’اسلام کی نشأۃِ ثانیہ‘‘ میں کیا گیا ہے ___ اس پر جو خط بانی محترمؒ نے انہیں تحریر کیا تھا اس کی حیثیت اب ایک تاریخی دستاویز کی ہے‘ لہٰذا وہ رفقائے تنظیم اسلامی کے افادہ کے لیے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور (رجسٹر)

۱۲۔افغانی روڈ‘ سمن آباد‘ لاہور

۳/مارچ ۱۹۷۵ء

برادرِ مکرم! وفقنا اللہ وایاکم لما یحبّ ویرضٰی!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!!

امید ہے کہ آپ مع اہل خانہ وجملہ احباب ورفقاء بخیر وعافیت ہوں گے۔

آپ کا یکم دسمبر ۱۹۷۴ء کا مرقومہ اور لگ بھگ ۲۰/جنوری ۱۹۷۵ء کا موصولہ سترہ صفحات پر مشتمل گرامی نامہ پیشِ نظر ہے۔ اس دوران میں کئی بار اس کا جواب تحریر کرنے کی غرض سے اسے از ابتدا تا انتہا پڑھا‘ لیکن پھر کوئی چیز ایسی سامنے آگئی کہ اُدھر متوجہ ہو جانا پڑا اور جواب رہ گیا۔

مجھے آپ سے ایک ’’حسنِ ظن‘‘ تو یقیناً تھا‘ لیکن اتنا ہرگز نہ تھا جتنا اس خط کے بعد ہو گیا ہے۔ احیائے اسلام کی ’’آرزو‘‘ (آپ کے پاس تو یقیناً اپنے خط کی نقل نہ ہو گی‘ اس لیے آپ کے الفاظ for ready reference درج کیے دیتا ہوں: ’’......اس جسارت کی محرک آپ سے ایک نسبت ہے۔ احیائے اسلام کی جس تڑپ نے آپ کو عمل پیہم پر اکسایا ہے وہ ایک آرزو کی شکل میں میرے دل میں بھی نشوونما پاتی رہی ہے......‘‘) بھی اس دور میں بسا غنیمت ہے‘ بقول علامہ اقبال ’’مسلم استی سینہ را از آرزو آباد دار!‘‘ اور ع ’’آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں ___ اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!‘‘ ___ اب اگر یہ آپ کے ’’دل میں نشوونما پاتی رہی ہے!‘‘ تو اور کیا چاہیے؟ فھو المطلوب! آرزو حقیقی اور طلب صادق ہو تو وہ اپنے لیے عمل کی راہیں خود پیدا کر لیتی ہے ___ جلد نہ سہی ذرا دیر سے سہی! کسی اور کے ساتھ نہ سہی اپنے طور پر سہی! (ع ’’تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن‘ اپنا تو بن!‘‘)

آپ نے میری تحریروں میں سے ’’نشأۃِ ثانیہ‘‘ کو بجا طور پر اہمیت دی ہے۔ میں خود بھی محسوس کرتا ہوں کہ میری اب تک کی سوچ کا نقطۂ عروج وہی ہے! مجھے بخدا نہ مفکّر ہونے کا دعویٰ ہے نہ متفکّر ہونے کا (حال ہی میں ایک رسالے میں ان دو الفاظ کے مابین فرق پر بحث نظر آئی ہے) تاہم میری تحریکی یا احیائی سوچ جیسی کچھ اور جتنی کچھ بھی ہے اس میں عمودی بلندی یا گہرائی کے اعتبار سے اہم ترین تحریر ’’نشأۃِ ثانیہ‘‘ والی ہی ہے۔ البتہ افقی وسعت کے اعتبار سے میری سب سے زیادہ اہم وہ تحریر ہے جو اکتوبر نومبر ۱۹۷۴ء کے ’میثاق‘ میں بطور ’’تذکرہ وتبصرہ‘‘ شائع ہوئی ہے! (مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ اسے آپ نے کچھ زیادہ ہی رواروی میں پڑھا ہے۔ کیا اس پر ایک نگاہِ بازگشت کے لیے وقت نکال سکیں گے؟) (نوٹ: یہ تحریر اب ’’تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر‘‘ کے عنوان سے طبع ہوتی ہے!)

آپ نے میری اس تحریر کے غالباً صرف اس حصے سے اختلاف ظاہر کیا ہے جو تبلیغی جماعت کی تحسین پر مشتمل ہے۔ بقیہ پورے مضمون کے main line of argument سے اغلباً آپ کو کامل اتفاق ہے۔ آپ کو اصل اندیشہ‘ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں‘ یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کی وسیع تر سرگرمیوں اور اس کی گراں تر ذمہ داریوں کے باعث ’’اسلام کی نشأۃِ ثانیہ‘‘ کے لیے کرنے کا اصل کام رہ جائے گا۔ خصوصاً میری قوتِ کار یا صلاحیت کار جتنی ہے وہ اس سے ظاہر

ہے کہ ایک ماہنامہ تو میں صحیح طرح چلا نہیں پایا —— مزید برآں یہ کہ ’’انجمن خدام القرآن کے دائرہ کار میں رہ کر آخر ایسی کون سی مشکل نظر آئی کہ ایک نئی جماعت بنانے کا ارادہ کر لیا؟‘‘

(۱) اس سلسلے میں اولین بات تو یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ دنیا میں علمی و فکری اور تحقیقی و تصنیفی کام صرف دو طریقوں سے ممکن ہیں۔ یا تو یہ کام حکومت کی زیر پرستی یا صحیح تر الفاظ میں نیم سرکاری اداروں کے تحت ہوتے ہیں جہاں کھلے وسائل موجود ہوں اور محققین و مصنفین کو باوقار مشاہرے دیے جا سکیں —— یا پھر یہ کام کسی زوردار انقلابی دعوت کو لے کر اُٹھنے والی تحریکوں اور جماعتوں کے زیر اہتمام ہو سکتا ہے جو ایک طرف ایسے محققین اور مصنفین پیدا کر سکیں جو مشاہروں سے بے پرواہ ہو کر محض مقصدِ زندگی کی دھن اور لگن میں اپنے آپ کو کھپا دیں اور دوسری طرف عوام میں اس کام کی اہمیت کا اتنا احساس اور شعور ضرور اُجاگر کر دیں کہ اس کے لیے جو کم از کم اور ناگزیر وسائل ضروری ہوں ان کی مسلسل اور uninterrupted بہم رسانی جاری رہے —— ان دو کے علاوہ کوئی تیسری ممکن صورت کم از کم میرے علم میں نہیں ہے!

ان میں سے بھی پہلے طریقے پر کوئی تخلیقی کام کبھی نہیں ہوا۔ سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کے تحت صرف آثارِ قدیمہ کی چھان پھٹک کی قسم کا کام ہو سکتا ہے جس سے ’’تراثِ علمی‘‘ (Academic Heritage) کی حفاظت کی خدمت تو سرانجام پا سکتی ہے کوئی تعمیری خدمت ممکن نہیں۔ لہٰذا ’’احیائے اسلام‘‘ کے لیے جس نوع کا علمی کام مطلوب ہے اس کے لیے اب صرف ایک راہ کھلی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک زبردست تحریک برپا ہو جو اوّلاً احیائے دین کی تڑپ اور لگن بیدار کر دے —— اور ساتھ ہی اس کے لیے جو اہمیت اس علمی کام کی ہے اسے واضح کرے، تاکہ ایک طرف اس کے لیے وسائل pool ہو سکیں —— اور دوسری طرف وہ نوجوان مل سکیں جو اس کے لیے عمریں کھپا دینے کا عزم مصمم کر لیں۔

یہی وجہ ہے کہ خود نشأۃ ثانیہ میں مَیں نے (صفحہ ۲۱ پر) ’’عملی اقدامات‘‘ کے عنوان کے تحت ’’قرآن اکیڈمی‘‘ کے ذکر سے بھی پہلے ’’دعوت و تبلیغ‘‘ کے ایک عمومی ادارے کے قیام کی ضرورت کا ذکر کیا ہے! بدیں الفاظ:

’’ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجہ ہوں اُن کی ذہنی و فکری

اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیت اُن لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے آرزومند ہوں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے......‘‘ الخ

جون ۱۹۶۷ء میں مَیں نے ’میثاق‘ میں وہ تحریر لکھی تھی جو اَب نشأۃِ ثانیہ نامی پمفلٹ کی صورت میں موجود ہے اور اسی سال کے اواخر میں عین اسی ضرورت کے تحت ’تنظیم اسلامی‘ کے قیام کی سعی ہوئی —— یہ دوسری بات ہے کہ وہ بعض وجوہ سے ناکام ہو گئی۔ لیکن اِس وقت عرض یہ کرنا ہے کہ اس کا قیام ’’نشأۃِ ثانیہ‘‘ کے اس پروگرام ہی کا ایک جزو تھا‘ نہ کہ اس کے باہر یا اس کے خلاف!

(۲) دوسری اہم اور توجہ طلب بات یہ ہے کہ —— ’’اسلام کی نشأۃِ ثانیہ‘‘ یا ’’تجدید و احیائے دین‘‘ ایک اجتماعی مسئلہ ہے‘ جبکہ ’’نجاتِ اُخروی‘‘ کا حصول ہر مسلمان کا ذاتی اور انفرادی مسئلہ ہے۔ ضروری نہیں کہ جو کام احیائے اسلام کے عظیم تر منصوبے کے اعتبار سے مقدم یا اہم تر ہو وہی ہر فرد کے ذاتی و انفرادی نقطہ نظر سے بھی مقدم اور اہم تر ہو —— پھر کون نہیں جانتا کہ علمی و فکری کام کرنے کی صلاحیت تو کسی کسی میں ہی ہوتی ہے —— جبکہ فلاحِ اُخروی کا حصول ہر انسان کے لیے ضروری و لابدی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو تنظیم اسلامی کا قیام ’’گھوڑے کے آگے گاڑی جوتنا‘‘ نہیں‘ بلکہ ٹھیک گھوڑے کو گاڑی کے آگے جوتنے ہی کا مصداق نظر آئے گا۔ (فَافْهَمْ وَتَدَبَّرْ!)

(۳) رہا مسئلہ میری قوتِ کار یا صلاحیت —— یا خصوصاً تنظیمی استعداد کا —— تو واقعہ یہ ہے کہ خود مجھے سب سے زیادہ کمزور پہلو یہی نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ایک بہت ہی کمزور اور بے صلاحیت انسان ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے ذہن ضرور رسا عطا فرمایا ہے اور سمجھ کی گہرائی بھی عطا فرمائی ہے اور یہ بھی اس کی بڑی نعمت ہے۔ ﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾! —— لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی مناسبت سے قوتِ کار یا صلاحیتِ عمل مجھ میں موجود نہیں ہے۔ اور مَیں خدا کو حاضر ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ اگر کوئی دوست یا بزرگ مجھے مطمئن کر سکتا کہ استعداد کی کمی یا صلاحیت کے فقدان کے باعث تم اس فریضۂ دینی سے بری ہو گئے ہو تو میں ان کا عظیم احسان اپنے اوپر سمجھتا‘ لیکن میرا حال بخدا یہ ہے کہ جو لوگ اس جانب سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہے ہیں ان کو دیکھ کر دل سے یہ صدا نکلتی ہے ؎

ما ہم بہ لاغ و لابہ تسلاّ شویم کاش!
ناداں ز بزمِ دوست چہ خوشنود می رود!

اس مسئلہ سے متعلق اصلاً تو مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ: ''جُز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ —— ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!'' (فیض) ویسے محض تفننِ طبع کے طور پر ذکر کر رہا ہوں کہ خصوصاً 'میثاق' کی اشاعت کی بے قاعدگی کے ذکر سے یاد آیا کہ مرحوم شیخ محمد اکرام نے مولانا مودودی کے بارے میں یہی لکھا تھا کہ —— ''تعجب کی بات ہے کہ ایک شخص بات تو حکومتِ الٰہیہ کے قیام کی کرتا ہے اور وہ بھی کسی محدود خطے میں نہیں پورے روئے زمین پر —— اور اس کی صلاحیتِ کار کا یہ عالم ہے کہ جنگ کے زمانے میں ۴۸ صفحات کا ایک ماہانہ پرچہ بھی باقاعدہ جاری نہ رکھ سکا!''

''تنظیم اسلامی'' کی ۱۹۶۷ء والی کوشش کی ناکامی کے اسباب متعدد ہیں —— کی بات بھی بالکلیہ غلط نہیں۔ internal sabotage بھی اس کا ایک سبب تھا —— اور خود وہ بھی بلاسبب نہ تھا (گلۂ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے۔ کسی بُت کدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری!) —— لیکن —— فاش تر گویم —— اس کی اصل وجہ یہ تھی اُس وقت جو لوگ جمع ہوئے ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اپنے آپ کو اس cause کے ساتھ completely identify کرتا —— کہ ''یا تن رسد بجاناں —— یا جاں ز تن بر آید!!'' سب لوگ اسے بس ایک اچھا کام سمجھ رہے تھے —— ہو جائے تو بہت اچھا ہے —— نہ ہو تو بھی ایسی کوئی بات نہیں! اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی کیفیت کے ساتھ پہلے سے چلتے ہوئے کام تو جاری رہ سکتے ہیں' کسی نئے کام کی داغ بیل نہیں پڑ سکتی —— ''در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطر ہاست بسے۔ شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی!''

اکتوبر نومبر ۷۴ء کے 'میثاق' کے ''تذکرہ وتبصرہ'' میں جس 'رجائیت' کی جھلک ہے وہ خالص وجدانی ہے اور کبھی کبھی حالات و واقعات کے پیشِ نظر خود مجھ پر 'قنوطیت' کا تسلّط ہونے لگتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ ہوتا ہے عارضی ہی۔ پھر کوئی نہ کوئی کرن امید کی نظر آجاتی ہے —— ویسے بحمد اللہ مَیں جس راہ پر چلنا چاہتا ہوں اس میں نتائج —— اور کامیابی کی امید ایک بالکل ثانوی —— بلکہ ''ثالثی'' شے ہے۔ اصل محرک صرف ایک ہے اور وہ ہے

احساسِ فرض —— جس کی تفصیل مَیں اپنی اس تقریر میں دے چکا ہوں جو اس پرچے میں شائع ہوئی ہے۔ (یہ تقریر اب ''عزمِ تنظیم'' کے نام سے طبع ہوتی ہے!)

باتیں تو اور بھی بہت سی کرنی تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معاملات 'باتوں' سے طے ہی نہیں ہوا کرتے —— اکثر باتیں تمام ہو جاتی ہیں اور مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ ''دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر: ما ہمچناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم!'' —— اصل معاملہ 'دل' کا ہوتا ہے۔ دل کسی بات کو قبول کر لے تو 'عقل' کو فوراً ہتھیار ڈال دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا —— اور 'دل' اِبا کر رہا ہو تو 'عقل' کرائے کے وکیل کی مانند دلائل کے انبار لگانے پر مستعد ہو جاتی ہے —— لہٰذا نبی اکرم ﷺ کے الفاظ مبارکہ کے مطابق گزارش ایک ہی ہے —— یعنی ''اِستَفتِ قَلبَکَ وَلَو اَفتَاکَ المُفتِی!''

اور اگر کسی درجہ میں درخواست بھی قابل قبول ہو سکے —— تو عرض ہے کہ ۲۳ تا ۳۱ مارچ آٹھ دن کی ''تفریغ'' (تبلیغی جماعت کی اصطلاح ہے ''تفریغِ اوقات'' یعنی وقت کا فارغ کرنا) کر ہی ڈالیں اور لاہور آئیں۔ تاسیسی اجلاس میں بھی شریک ہوں —— اور قرآن کانفرنس میں بھی! پھر جو بھی فیصلہ ہو' ظاہر ہے کہ جبر کا تو کوئی سوال ہی نہیں! —— آخر میں صرف ایک بات اور عرض کر دوں —— آرزو بھی یقیناً بہت غنیمت ہے لیکن تا بہ کے؟ اگر یہ واقعتاً سینے کے اندر پرورش پاتی رہی ہے تو اب وقت ہے کہ ''برآور ہر چہ اندر سینہ داری!''

فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ
اصل حقیقت' اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج
بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

عہدِ حاضر کی ریاست ’اسرائیل‘ کو تسلیم کرنے کا مسئلہ

انجینئر مختار حسین فاروقی

● اسرائیل ------ پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۷ء) کے دوران عظیم سلطنت عثمانیہ کو برطانوی صہیونی استعمار کے ہاتھوں شکست کے بعد ایک طویل سازش کے ذریعے ۱۹۴۸ء میں قائم ہونے والی ریاست ہے۔

● ’اسرائیل‘ کے نام سے اس ریاست کا قیام کوئی الگ تھلگ (isolated) واقعہ نہیں ہے۔ اس ریاست کو قائم کرنے والی قوتوں (بنی اسرائیل اور اس کے اتحادیوں) نے اس ریاست کے ذریعے جن مقاصد کی تکمیل کا خواب دیکھا ہے وہ (چونکہ اکثر حکومتوں اور عوام سے) پوشیدہ ہیں‘ لہٰذا سطحی نظر سے دیکھنے میں ریاست اسرائیل کو تسلیم کرنے کا مسئلہ بڑا معصوم سا نظر آتا ہے۔

● بنی اسرائیل سابقہ مسلمان اُمّت ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل☆ تھا۔ ان کے بارہ بیٹوں کی نسل پر مشتمل یہ اُمّت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاندان میں نبوت و کتاب کی تخصیص (الحدید:۲۶ اور العنکبوت:۲۷) کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل عالمی تجارت میں چلے گئے اور یوں مشرق و مغرب کی معاشیات پر چھا گئے۔ بنی اسرائیل کی حکومت کمزور ہوئی تو مقامی باشندے (Blacks) فراعنہ مصر کے نام سے حکمران بنے۔ اُس دور میں بنی اسرائیل فرعونوں کے غلام رہے۔ فراعنہ اُن پر بہت ظلم کرتے رہے اور یہ اُن کے لیے ذلّت و رسوائی کا دور تھا۔

● اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان میں مبعوث فرمایا اور فرعونوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے فرعون غرق ہوا۔ اس بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے بڑے

☆ یہ لفظ اسر+ایل سے مرکب ہے۔ اس کا معنی ہے: اللہ کا قیدی یا اللہ کا بندہ

احسانات کیے اور معجزات دکھائے‘ تورات عطا فرمائی اور اُمّتِ مُسلمہ بنایا۔

● اس قوم کو جہاد کا حکم ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی جہاد سے صاف انکار کر دیا جس سے یہ فلسطین میں داخل نہیں ہو سکے۔ ان کو چالیس سال کی صحرانوردی کی سزا ملی‘ جس کے دوران حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کا انتقال ہو گیا۔ پھر حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کے دور میں جہاد ہوا اور علاقہ فتح ہوا‘ مگر بنی اسرائیل نے ایک مرکزی حکومت قائم کرنے کی بجائے اپنے بارہ قبیلوں کی علیحدہ علیحدہ سلطنتیں بنا لیں۔ یہ آپس میں لڑتے رہتے تھے (البقرۃ:۸۵) حتیٰ کہ تابوتِ سکینہ بھی دشمن لے گئے اور ان کو سزا ملی تھی۔

دوسرے پارے کے آخری رکوع میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ حضرت طالوت کی سرکردگی میں جہاد ہوا اور حضرت داؤد علیہ السلام پیغمبر ہوئے اور بادشاہ بھی۔ بعد ازاں حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہوئے اور پیغمبر بھی۔ پھر ایک اور بادشاہ گزرے۔ یہ تینوں دور ملا کر ۱۰۰۰ ق م سے ۹۰۰ ق م تک کی یہ صدی بنی اسرائیل کا دورِ عُروج ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دورِ عروج میں بنی اسرائیل عالمی تجارت پر چھا گئے۔ ایک خاندان‘ آسمانی ہدایت اور ایک صدی سے وسیع علاقہ پر غلبہ۔ لہٰذا یہ سارے عالم میں تجارتی مراکز پر پہنچ گئے اور وہاں آباد ہو گئے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے دورِ عروج میں ہی بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے جادو سیکھا اور سرّی علوم (Occult sciences) میں مہارت حاصل کی۔ (البقرۃ:۱۰۲) ----- علم الاعداد ایجاد کر کے تعویذات اور نقش بنانے کا فن عام کیا (آج بھی ان تعویذات اور نقش‘ کا جو مجموعہ ملتا ہے وہ ’’نقشِ سلیمانی‘‘ کے نام منسوب ہے‘ حالانکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اس شیطانی فن سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں تھا)۔

● دورِ عروج کے بعد جلد ہی زوال آیا اور عالمی تجارتی غلبے کے باعث یہ قوم بگڑ گئی۔ اپنی ہی نسل (بنی اسرائیل) میں آنے والے انبیاء کرام علیہم السلام کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پھر زوال آ گیا اور عراق کے بادشاہ بخت نصر نے حملہ کر کے ہیکل سلیمانی تباہ کر دیا۔ بنی اسرائیل کا قتل عام کیا اور لاکھوں کو قیدی بنا کر ساتھ لے گیا اور اپنی حکومت میں پھیلا کر قیدی بنا کر رکھا۔ حضرت عزیر علیہ السلام کی آمد پر ان کو ۱۵۰ سال کی اس غلامی سے نجات ملی۔ ایران کے ایک خدا ترس بادشاہ (سائرس یا کیخسرو) نے عراق پر حملہ کر کے اسے فتح کیا تو بنی اسرائیل کو آزادی ملی۔ سائرس نے ان کو فلسطین میں آباد ہونے میں مدد کی۔ (ایران اور بنی اسرائیل کے قدیمی روابط ہیں اور یہ ایک دوسرے کے احسان مند ہیں)

● حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام نے بادشاہ اور پیغمبر ہونے کے ناطے جو ہیکلِ سلیمانی (عبادت گاہ) تعمیر کرایا تھا‘ جسے بخت نصر نے گرا دیا تھا‘ اب بنی اسرائیل نے یہ ہیکل دوبارہ تعمیر کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسرائیل کو دوبارہ عروج دے دیا اور ایک سلطنت قائم ہوگئی۔ (بنی اسرائیل: ۶ تا ۱۰)

● بنی اسرائیل نے اس دوسرے عروج کے دوران پھر پہلے عروج کی طرح خرمستیاں کیں اور آسمانی ہدایت سے غفلت برتی۔ ؏ ’’خدا جب حُسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے‘‘ کے مصداق‘ دنیاداری اور دنیاوی مفادات میں ایسے پڑے کہ آسمانی ہدایت کو پھر بھلا دیا اور پیغمبروں کے قتل کا سلسلہ جاری رہا۔ اب روم سے حملہ آور آئے اور انہیں تہس نہس کر کے غلام بنا لیا۔ اس دور میں بالواسطہ طور پر ہی سہی‘ انہوں نے حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کو قتل کرا دیا۔ اتنے دلیر ہوئے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے‘ جو ایک صاحبِ کتاب رسول تھے‘ جن کی پیدائش معجزانہ تھی (قرآن مجید میں سورۂ مریم میں تفصیل سے یہ ذکر ہے) تو بنی اسرائیل کے ایک قلیل گروہ کے علاوہ اکثریت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا اور انہیں مرتد قرار دے کر سولی کی سزا سنا کر رومی حکمرانوں کے حوالے کر دیا اور سزا پر عمل درآمد کرنے کو کہا۔

انجیل برناباس میں مذکور تفصیل کے مطابق سارا منصوبہ تیار ہوا اور ایک شخص مخبر بنا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے موقع پر اس شخص کی شکل ہو بہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شکل جیسی ہوگئی‘ چنانچہ گرفتار اُسے کیا گیا‘ بعد ازاں اسے سولی پر چڑھا دیا گیا۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق ﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ﴾ (النساء: ۱۵۷) ’’اور انہوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور نہ انھیں سولی پر چڑھایا‘ بلکہ ان کے لیے وہی صورت بنا دی گئی تھی۔‘‘ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے زندہ آسمان پر اُٹھا لیا۔ وہ اب تک حیات ہیں اور قربِ قیامت میں دمشق میں ایک جگہ اُترنے والے ہیں۔

● بنی اسرائیل پر اس ’رفعِ آسمانی‘ کے واقعے کے بعد فلسطین میں عذاب آ گیا۔ روم سے ہی ایک دوسرا فاتح ٹائٹس (Titus) رومی اُٹھا اور فلسطین پر ۷۰ء میں (آج سے ۱۹۵۰ سال پہلے) حملہ کر دیا۔ ہیکل سلیمانی کو دوسری مرتبہ زمین بوس کر دیا گیا اور بنی اسرائیل کا قتل عام کیا۔ جو زندہ بچے ان کو فلسطین سے جلاوطن کر دیا۔☆

☆ بنی اسرائیل کی اہلِ روم سے دشمنی ہونی چاہیے مگر نامعلوم کیوں دوستی ہے؟

● اس دور کو بنی اسرائیل اپنے لیے دورِ انتشار (Diaspora) کہتے ہیں۔ فلسطین سے نکل کر وہ جہاں سینگ سمائے‘ جا کر آباد ہوئے۔ مدینہ میں آباد تین یہودی قبیلے جو حضرت محمد ﷺ کی آمد پر بھی موجود تھے‘ وہ آپؐ کے انتظار میں یہاں آ کر آباد ہوئے تھے۔

بنی اسرائیل اپنے عالمی تجارتی رابطوں کے سبب جہاں جہاں ان کے لیے موزوں ہوا وہاں آباد ہوئے اور مسلمانوں کے دورِ عروج اور اُس کے بعد عالمی تجارت پر بلاشرکت غیرے قابض ہیں۔

● قرآن مجید کے مطابق مدینہ کے یہودی (بنی اسرائیل) حضرت محمد ﷺ کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے والد اپنی اولاد کو پہچانتا ہے‘ مگر پھر بھی ایمان نہ لائے‘ بلکہ جنگ بدر تا جنگ خندق آپ ﷺ کے خلاف (میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے) اہلِ مکّہ کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اُبھارتے رہے۔ تاہم ہر دفعہ شکست کے نتیجے میں بنی اسرائیل کے تینوں قبیلوں کو یکے بعد دیگرے مدینہ سے نکال دیا گیا‘ مگر انھوں نے پیغمبرِ وقت حضرت محمد ﷺ سے نہ تو معافی مانگی نہ اپنا جرم تسلیم کیا‘ بلکہ جلاوطن ہو کر خیبر میں آباد ہو گئے۔ حدیبیہ کے مقام پر اہلِ مکّہ سے صلح کے بعد‘ محرم ۷ھ میں جنگ خیبر کے بعد وہاں سے بھی شمال مشرقی عرب کی طرف نکال دیے گئے۔

● اُس وقت سے بنی اسرائیل مسلمانوں سے حالتِ جنگ میں ہیں۔ خود آگے نہیں آتے‘ بلکہ دوسروں کو آگے کر کے خود نتیجہ دیکھتے ہیں‘ سازشوں کا جال بُنتے ہیں اور خود بزعم خویش بچ جاتے ہیں۔

● حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کو تسلیم نہ کرنا بنی اسرائیل کی سوچی سمجھی سازش تھی اور اب بھی مسلمانوں کا خاتمہ ان کا مقصدِ وحید ہے (جو ان شاء اللہ کبھی پورا نہیں ہوگا)۔

اس انسان دُشمن‘ وحی دُشمن اور خدا بیزار نظریے پر وہ آج بھی مُصر ہیں۔ پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک قتل انبیاء کا جرم کیا‘ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی تک پہنچایا اور فلسطین بدر ہو گئے مگر حق قبول نہ کیا۔ حضرت محمد ﷺ کی آمد پر‘ جن کا ذکر اُن کی کتابوں میں ہے‘ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلاصی (bail-out کرنے) کا موقع دیا‘ مگر انہوں نے اس موقع کو ضائع کر دیا۔ ارشاد ہوا: ﴿عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ﴾ (بنی اسرائیل: ۸) ’’ہوسکتا ہے کہ اب تمہارا ربّ تم پر رحم کرے‘ اور اگر تم نے وہی روش اختیار کی تو ہم بھی وہی کچھ کریں گے۔‘‘

● اپنے دورِ انتشار میں قرآن مجید کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل بہت بگڑ گئے تھے۔ (المائدۃ: آیات ۱۲۔ ۱۳، ۱۸، ۲۱ تا ۲۶، ۶۲ تا ۶۶، ۷۰۔۷۱، ۷۸ اور الاعراف: آیات ۱۶۶۔۱۶۷، ۱۷۰ اور التوبۃ: آیات ۳۰ تا ۳۴) مگر ان میں قلیل تعداد اچھے لوگوں کی بھی تھی۔ یہ اچھے لوگ کہیں خراسان کے علاقوں میں آباد تھے۔ مدینہ میں آنے اور آباد ہونے والے یہود پیغمبر دشمن تھے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور قتل کے لیے یہاں آباد تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آخری پیغمبر بھی بنی اسرائیل میں سے آئے گا، مگر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں آ گئے۔

● بنی اسرائیل بہت پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت حضرت اسماعیل علیہ السلام کا انکار کر چکے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حضرت اسحاق علیہ السلام کے علاوہ کوئی بیٹا تھا ہی نہیں (اسی لیے یہود و نصاریٰ میں ابراہیم، یعقوب، یوسف، بن یامین، موسیٰ، ہارون، لوط، داؤد، سلیمان، زکریا، یحییٰ، دانیال وغیرہ نام ہیں، مگر نہیں ہے تو صرف اسماعیلؑ کا، حالانکہ وہ ابراہیمؑ کے بعد سب سے مقدم نام ہونا چاہیے تھا)۔ گویا حضرت محمد ﷺ کا مکمل انکار کرنے کے لیے ان کے جدامجد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ہی انکار کر دیا گیا۔ اس سے بڑا کتمانِ حق، دینی جرم اور خدا بیزاری و انسان دشمنی کیا ہو سکتی ہے؟

● اس پر مستزاد یہ کہ بنی اسرائیل حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بعد بھی اسلام دشمنی اور انبیاء دشمنی سے باز نہیں آئے۔ گزشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ دنیا بھر میں صرف بنی اسماعیل (یعنی حضرت محمد ﷺ اور ان کی اُمتِ عرب اور 'اٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ') اور بنی اسرائیل کی کشاکش اور آویزش کا ہی نام ہے۔ کبھی یہ سرد جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کبھی یہ گرم جنگ کی صورت میں ہوتی ہے۔ یہ جنگ اسلام کے صدرِ اوّل سے آج تک ہمہ وقت جاری ہے۔

اسلام میں حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی شہادت، ۳۶ھ تا ۴۰ھ مسلمانوں کے مابین خانہ جنگی اور ایک لاکھ مسلمانوں کا باہمی قتل، واقعہ کربلا اور واقعہ حرہ بھی بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی اسی باہمی جاری دشمنی کے شاخسانے ہیں۔ اسی طبقے نے ۷۵۰ء کے لگ بھگ سدِّ ذوالقرنین کے پار جارجیا کی ریاست کے پاس روسی علاقہ میں ایک بادشاہ کو اپنے مذہب میں داخل کر کے 13th Tribe کا نام دیا۔ پھر اس کو جائز و ناجائز سپورٹ کر کے عالمی تجارت میں عروج دینے کے وعدے پر ساتھ ملایا۔ اس تیرہویں قبیلے کے ذریعے فلسطین میں سازشیں کر کے پہلے کاغذی نوٹ (paper currency) اور پھر بینک (Bank of England) ۱۶۴۰ء میں قائم کیا،

جس کے ذریعے سودی نظام کو جاری کر کے عالمی معیشت پر اپنے پنجے گاڑ دیے، جو آج اپنے منطقی عروج پر ہے۔

تیرھویں قبیلہ کے افراد آج دنیا بھر کی معیشت پر ''ملٹی نیشنلز'' کے نام سے قابض ہیں۔ یو این او کے نام سے عالمی سلطنت قائم ہے اور ایشین بینک، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف سب ان کے زیر انتظام ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کی ناجائز ریاست قائم ہوگئی جو ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی جنگوں کے بعد پھیل گئی، جس سے مسلمانوں کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کی جگہ دِمشق کو مخدوش بنا دیا گیا ہے۔

● بنی اسرائیل کے نظریات کی حامل، اسرائیل کی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے۔ قرآن مجید کے مطابق بنی اسرائیل کے نظریات بڑے واضح ہیں اور انسانیت کے لیے بڑے خوفناک ہیں۔ خدا بیزار، وحی مخالف اور انسان دشمن نظریات کا تانا بانا گزشتہ تین چار ہزار سال کی تاریخ پر پھیلا ہوا ہے۔

● قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے انسان دشمن نظریات مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ اشارات کی صورت میں ہم آیات کے حوالہ کے ساتھ یہاں درج کر رہے ہیں۔

i) نسلی تفاخر (white racism)

ii) 'نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ' کا خدادشمن نظریہ (المائدۃ:۱۸)

iii) غیر اسرائیلی اقوام کی اہانت کی سوچ۔ ''انسان نما حیوان'' کا نظریہ (ڈارون تھیوری کے تحت Goyims اور Gentiles)

iv) اسرائیل کی اولاد کے علاوہ جو افراد اور نسلیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں ایمان لائیں وہ بھی 'بنی اسرائیل' کے برابر نہیں ہیں۔

عبادت گاہوں میں علیحدہ جگہ۔

رَجُلٌ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ کا خاندان، جادوگروں کا گروہ، فرعون کی اہلیہ، ملکہ سبا (بلقیس) اور تیرھواں قبیلہ۔

● ریاست اسرائیل کے founding fathers بنی اسرائیل ہیں، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرات داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ماننے والے ہیں۔ تورات کے حامل ہیں۔

● قرآن مجید کے بیان‘ احادیث میں اشارات اور تاریخی حقائق کے مطابق یہی بنی اسرائیل ۶۰۰ ق م سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے تک قتلِ انبیاء کے جرم میں ملوث رہے۔ گویا بنی اسرائیل بظاہر آسمانی وحی اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں‘ آسمانی وحی کے institution پر ایمان رکھتے ہیں‘ مگر ۶۰۰ ق م سے ۶۰۰ صدیاں اپنے ہی خاندانِ آلِ یعقوب (بنی اسرائیل) میں آنے والے انبیاء علیہم السلام کے قتل کرنے والے ٹھہرے (کہ آسمانی ہدایت کا انکار ہے‘ ہمیں آسمانی ہدایت نہیں چاہیے بس تورات کافی ہے‘ حالانکہ تورات بھی گم ہوگئی‘ نہ اس کی تفتیش‘ نہ ایف آئی آر‘ نہ مجرموں کی تلاش اور تعین۔ کہیں گائے یا بکری گم ہوجائے تو اُس دور میں بھی قانون موجود تھا کہ مجرموں کو سزا ہو مگر تورات کی گمشدگی planned لگتی ہے اور ’خود چھپائی‘ گئی ہے‘ اس لیے اس کی دستیابی کا امکان نہیں ہے)۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ابلیسی نظریات کے سرپرست یعنی یونانی اصنام پرستی اور رومی حکمرانوں کے تعذیب کے طریقوں کے مبلغ۔ آج فلم انڈسٹری کے مالک‘ انٹرنیٹ پر بے حیا اور لبرل کلچر کے سرپرست‘ حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر عذاب آنے کی جگہ کو سیاحتی مقام بنانے کے مرتکب۔

● قرآن کریم میں ارشاد ہے (الحدید:۲۶) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آمد اپنی سُنّتِ اِرسالِ انبیاء و رُسل میں دو اہم ’land mark‘ کے طور پر نمونہ بنا دی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد صرف اُن کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب رکھ دی۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد بالخصوص انہی کی اولاد کو پیغمبری اور کتاب کے لیے مختص کر دیا۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر ہے تو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہی ہوگا۔ بعض مؤرخین بدھ مت کے بانی اور چند دیگر شخصیات کو پیغمبر مانتے ہیں‘ تاہم حضرت محمد ﷺ سے پہلے کسی شخص کو نبی ماننے کے لیے اُس کا اولادِ ابراہیم سے ہونا لازمی ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کے اعلان کے بعد بنی اسرائیل نے شمال مشرقی عرب (جہاں وہ خیبر سے نکالے جانے کے بعد آباد تھے) سے ہی جھوٹے‘ فرضی اور خودساختہ نبی کھڑے کرنے کا آغاز کر دیا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ احادیث پاک میں ہے کہ دجالِ اکبر بھی آئے گا‘ وہ ’مسیح‘ یعنی نبی ہونے کا ہی دعویٰ کرے گا۔ قتلِ انبیاء اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کی سرپرستی ایک ہی کھوٹے سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ختم نبوت کے اعلان کے بعد جھوٹے نبی بنائے گئے

کہ اب آسمانی وحی کے ذریعے ان ’نبیوں‘ کی تغلیط ممکن ہی نہیں۔ (العیاذ باللہ من ذٰلک)

● آج (قربِ قیامت کے دور میں) عیسائی بھی اپنے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے منتظر ہیں‘ مسلمان الگ منتظر ہیں (قرآن وحدیث کے مطابق) اور یہود اپنے زُعم میں منتظر ہیں کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے تو انہوں نے ان کو مانا نہیں‘ لہٰذا اپنی مذہبی پیش گوئیوں کے مطابق وہ ’اصلی‘ مسیح کی آمد کے منتظر ہیں (جبکہ مسلمانوں کے نزدیک‘ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے اور بنی اسرائیل کے انکار پر وہ آسمان پر اٹھا لیے گئے جس پر بنی اسرائیل پر ۷۰ء میں عذاب آ گیا‘ لاکھوں قتل ہوئے اور باقی فلسطین سے نکال دیے گئے)۔

مسلمانوں کے مسیح علیہ السلام اب قربِ قیامت میں دوبارہ آئیں گے‘ شام کے شہر دمشق کے ایک مینار سے اُتریں گے اور مسلمانوں (اور قلیل مخلص عیسائیوں) کے ساتھ زمینی طور پر فلسطین‘ تل ابیب آئیں گے۔ اس کے مدِّمقابل Anti-Christ اصفہان سے نکلے گا۔

☆ یہود جس ’مسیح‘ کا انتظار کر رہے ہیں وہ اصفہان سے ظاہر ہوگا۔ مسلم شریف (کتاب الفتن) کی حدیث کے مطابق دجال بھی اصفہان سے ظاہر ہوگا اور ستر ہزار یہودی سیاہ چغے پہنے اس کے ساتھ ہو جائیں گے۔ ہم مسلمانوں کے نزدیک اصفہان سے ظاہر ہونے والا ’مسیح‘ ’مسیح الدجال‘ اور Anti-Christ ہوگا‘ جبکہ بنی اسرائیل اور آج کے اسرائیلی اور اس کے اتحادیوں کے نزدیک اصفہان سے ظاہر ہونے والا اصل ’مسیح‘ ہوگا اور شام (دِمشق) سے ظاہر ہونے والا Anti-Christ ہوگا۔ یہی نظری اختلاف جنگ کا باعث بنے گا‘ جب مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اصفہان سے آنے والے ’مسیح الدجال‘ کو (ترمذی کی روایت کے مطابق) اسرائیل میں تل ابیب کے نزدیک ایئربیس لُدّ (Lydda) کے دروازے پر قتل کر دیں گے۔

ان نظریات کی روشنی میں اگر آج ہم اسرائیل کو تسلیم کرتے ہیں تو آنے والے وقت میں شدید ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اشارۃً درج ذیل معاملات پیش آ سکتے ہیں:

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے قبل شام میں کیے گئے اسرائیلی اقدامات کی حمایت۔ اسرائیل شام سرحد بند کرنے پر اسرائیل کی حمایت۔ یوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اسرائیل میں داخلے اور تل ابیب تک جانے میں رکاوٹ ہوگی۔

(۲) اصفہان سے ظاہر ہونے والے دجال (جو کئی یورپی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کا دورہ کرے گا اور مدینہ پر بھی حملہ آور ہوگا) کی سفارتی و اخلاقی حمایت کرنا ہوگی جو مرزا قادیانی

سے ایک ہزار گنا بڑے ’جھوٹے مسیح‘ کی تائید کے مترادف ہوگی۔

(۳) ہمیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام (جو دمشق سے آئیں گے) کے ساتھ ہو کر اسرائیل پر حملہ آور ہونا ہے۔

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کے بعد بنی اسرائیل (یہود) اور ان کی ساری اتحادی قوتوں کو شکست ہونا ہے۔ گویا امریکہ‘ یورپ‘ مسیحی دنیا‘ ساری ملٹی نیشنلز‘ کل مغربی میڈیا‘ تمام فلمی اداکار اور اداکارائیں‘ فلم انڈسٹری سے وابستہ تمام افراد‘ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا سے وابستہ بے حیائی کے نمائندہ افراد‘ سیکس ورکرز‘ تمام سیکولر‘ لبرل اور دین دشمن اینکر پرسن اور میڈیا سے متعلق افراد‘ تمام کرپٹ‘ حرام خور‘ سود خور اور مغرب کے ایجنٹ مسلمان اشرافیہ اور بیوروکریسی (سوائے ان کے جو دجال کے ظہور سے پہلے اسلام مخالف سوچ اور رویوں سے سچی توبہ کر لیں) سب کے سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دِمشق میں آمد پر معجزانہ طور پر (غالباً سٹار وارز کے ذریعے) دجال کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جائیں گے۔ تمام یہود قتل کر دیے جائیں گے۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے سے اوپر درج باتوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عملی اقدامات کی حمایت کی بجائے ان کی مخالفت میں تباہی یقینی ہے۔

اس وقت اسرائیل ’شر‘ کی علامت ہے۔ اس کا ساتھ دینا حقیقی مسیح عیسیٰ علیہ السلام کی آمد کی نفی کرنا اور دنیا و آخرت خراب کرنا ہے۔ نیز بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کی چودہ صدیوں کی جنگ میں اب اسرائیل کو تسلیم کرنا درحقیقت اپنی شکست تسلیم کرنا ہے۔ مزید برآں‘ اپنے ماضی (حضرت محمد ﷺ کی سیرت‘ خلافت راشدہ‘ سقوطِ بغداد میں بنی اسرائیل کا کردار‘ جنوبی ایشیا میں مغلیہ سلطنت کا زوال‘ سکھوں کی حکومت کا قیام‘ انگریزوں کا دہلی پر قبضہ اور سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف صہیونی کارروائیاں اور بالآخر خلافت کے ادارے کا خاتمہ‘ فلسطین میں یہود کی آبادکاری اور اسرائیل کا قیام‘ ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۳ء کی اسرائیل کی جنگیں) اور اسلاف سے قطع تعلق کرنے کے مترادف ہے۔ عصرِ حاضر میں یو این او کے نام پر اور انسانی حقوق اور بقائے باہمی کے خود ساختہ اصولوں پر ملکوں کو تسلیم کرنے کی Zionist پالیسیاں اختیار کرنے سے ہم اپنی دینی شناخت کھو دیں گے۔

مزید برآں اسرائیل کو تسلیم کرنا —— تحریک آزادی اور قیامِ پاکستان کی جدّوجہد‘ دوبارہ اسلام کے عالمی غلبے اور خلافت راشدہ کے ادارے کے احیاء کی سنہری پیغمبری پیش گوئیوں اور قرآنی تصوّرات سے بھی ہاتھ دھونے کے مترادف اور پاکستان کو صفحۂ ہستی سے خود مٹانے کی

دستاویز پر دستخط کرنے کے برابر ہے۔ نیز مبشر پاکستان علامہ اقبال اور بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے یہود اور اسرائیل سے متعلق واضح نظریات کے بعد‘ لیاقت علی خان کے امریکی کانگریس میں ’’اسرائیل کو تسلیم کرنے پر پاکستان کے سارے معاشی مسائل حل کر دیں گے‘‘ کے جواب میں "Gentlemen, our souls are not for sale" کہنے پر سجدۂ سہو کرنے کے برابر ہے۔

عالمِ اسلام اور پاکستان کی مسلمان اشرافیہ کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ تاریخ کے بہاؤ میں جب دین ’قیام‘ کا تقاضا کرتا ہے‘ ہم مغربی آقاؤں اور بنی اسرائیل کے عالمی دجالی صہیونی منصوبوں (از قسم کعبہ کو گرانے کی کوشش‘ وسیع تر اسرائیل کے قیام کے لیے آپ ﷺ کے دور کے مدینہ کو اس میں شامل کرنا وغیرہ) کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کیا منہ دکھائیں گے! ہمارے پاس مسلمان رہنے کی دلیل کیا رہ جائے گی؟

اسرائیل کو تسلیم کرنا یہودیت کے نظریات قبول کر کے بنی اسرائیل کا ہم مذہب بننا ہے۔ اس عمل سے دنیا میں تباہی اور آخرت میں جہنم ہمارا مقدر ہوگی۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَ لَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ الۡہُدٰی ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾﴾

’’اور تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی‘ یہاں تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی اختیار کر لو۔ اور (اے پیغمبر ﷺ!) اگر آپ اپنے پاس علم (یعنی اللہ کی وحی) کے آ جانے کے بعد بھی ان کی خواہش پر چلو گے تو آپ کو اللہ (کے عذاب) سے (بچانے والا) نہ کوئی دوست ہوگا نہ کوئی مددگار۔‘‘

اللہ تعالیٰ ہمیں بنی اسرائیل کے راستے پر چلنے‘ ان سے دوستی کرنے اور ان کی چالوں سے بچائے۔ آمین!

پ ن: آج کے بنی اسرائیل فلسطین کی دیوارِ گریہ پر جا کر پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں کیا کہتے ہیں‘ اس ویب سائٹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

https://www.youtube.com/watch?v=KTl15GQeP0E

مَقامِ محمود
اور
غلبہ واقامتِ دین کے کارکنوں کے لیے زادِراہ

انجینئر محمد رشید عمر

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ﴿٧٩﴾ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿٨٠﴾ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿٨١﴾﴾ (بنی اسرائیل)

’’رات کے بعض حصہ میں (اٹھو اور) نماز تہجد ادا کرو‘ یقیناً فائز فرمائے گا آپ کا رب آپؐ کو مقامِ محمود پر۔ اور دعا مانگا کیجیے: اے میرے ربّ! مجھے ہر داخل ہونے کی جگہ میں سچائی کے ساتھ داخل کیجیے اور ہر نکلنے کی جگہ سے سچائی کے ساتھ نکالیے اور اپنی جناب سے قوت واقتدار کے ساتھ میری مدد کیجیے۔ اور آپؐ (اعلان) فرما دیجیے کہ حق آ گیا ہے اور باطل مٹ گیا ہے‘ اور بے شک باطل تھا ہی مٹنے والا۔‘‘

قیامت تک پانچ وقتہ اذان کے بعد لاکھوں کروڑوں اہلِ ایمان نبی کریم ﷺ کے لیے اللہ ربّ العزت سے دعا مانگتے ہیں کہ اپنے پیارے نبی کو مقامِ محمود عطا کیجیے‘ اس کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے حبیب ﷺ سے اس کا وعدہ فرما چکا ہے۔ اہلِ ایمان کی یہ دعائیں آپؐ کے مقامِ محمود میں ترقی کا ذریعہ بھی بنیں اور اس کی وجہ سے خطا کار اُمتیوں کو نبی کریم ﷺ کی شفاعت

نوٹ: اس مضمون میں نماز تہجد کی فضیلت اور منہج انقلاب نبویؐ میں اس کی اہمیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ فقہی لحاظ سے اس کے مقام اور احکام سے صرفِ نظر کیا گیا ہے۔

بھی نصیب ہو جائے۔ اپنے رب کی کبریائی کو دنیا میں بالفعل قائم کر کے انسانیت کو بندگی کے بلندترین مقام پر پہنچانے والی ہستی اس بات کی مستحق ہے کہ انہیں یہ مقام عطا کیا جائے کہ زبانوں پر ان کے لیے تعریف وتحسین کے کلمات جاری ہو جائیں۔ یہ بہت بھاری ذمہ داری تھی۔ نماز تہجد سے اس کا آغاز ہوا اور زھوقِ باطل پر یہ جدّوجہد پایہ تکمیل کو پہنچی۔

’’داخل کرنے سے مراد فریضہ نبوت میں داخلہ اور خارج کرنے سے مراد فرضِ نبوت کی انجام دہی سے فراغت‘ یعنی اے اللہ جو امر نبوت تُو نے میرے سپرد کیا ہے اس میں صدق کے ساتھ مجھے داخل فرما اور صدق کے ساتھ ہی مجھے اس کی ادائیگی کی توفیق عطا فرما۔ جب میں اس دنیا سے جاؤں تو نبوت کے فریضے کو کامل طور پر ادا کر چکا ہوں۔‘‘ (تفسیر مظہری)

غلبۂ دین کی جدّوجہد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے اس دین کو کہاں کہاں پیش کیا۔ اس دین کو لوگوں کے دلوں میں اُتارنے کے لیے اور اکڑی ہوئی گردنوں کو اللہ کے حضور جھکنے کی لذّت سے آشنا کرنے کے لیے آپؐ کی جدّوجہد کن مراحل سے گزری؟ یہ جدّوجہد آپؐ کی تیئس سالہ زندگی پر پھیلی ہوئی ہے‘ تیرہ مکّی سال اور دس مدنی سال۔ انتہائی اختصار کے ساتھ صاحب ’’الرحیق المختوم‘‘ کے مطابق مکّی زندگی کے تیرہ سال تین مرحلوں پر مشتمل تھے:

(۱) انفرادی دعوت کا مرحلہ تین برس پر محیط تھا۔ اس مرحلہ میں اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ ؓ آپ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ ؓ آپؐ کے چچیرے بھائی حضرت علی اور آپؐ کے یارِ غار حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں۔ یہ سب کے سب پہلے ہی دن مسلمان ہو گئے۔ حضرت ابوبکر ؓ کی کوششوں سے حضرت عثمان‘ حضرت زبیر‘ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف‘ حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ ؓ ایمان لائے۔ یہ بزرگ اسلام کا ہراول دستہ بنے۔ شروع میں اسلام لانے والوں میں حضرت بلال ؓ بھی ہیں۔ ان کے بعد امینِ اُمّت حضرت ابوعبیدہ عامر بن جراح‘ ابوسلمہ‘ ارقم بن الارقم‘ عثمان بن مظعون اور ان کے دونوں بھائی قدامہ اور عبداللہ‘ عبیدہ بن حارث‘ سعید بن زید اور ان کی بیوی فاطمہ (حضرت عمرؓ کی ہمشیرہ) خباب بن ارت‘ عبداللہ بن مسعود ؓ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ یہ لوگ مجموعی طور پر قریش کی تمام شاخوں سے تعلق رکھتے تھے۔

(۲) اہلِ مکّہ میں کھلم کھلا دعوت کا مرحلہ ۴ نبوی سے ۱۰ نبوی کے اواخر تک پھیلا ہوا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آپ ﷺ کو ملا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾﴾ (الشُّعراء) ’’اپنے

نزدیک ترین قرابت داروں کو خبردار کیجیے'' تو آپؐ نے متعدد بار اپنے خویش قبیلہ کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا۔ اس کے نتیجے میں نبی اکرم ﷺ کے ایک چچا ابولہب نے آپؐ کی مخالفت پر کمر کس لی اور ایک چچا ابوطالب نے آپؐ کی حمایت اور نصرت کا پختہ ارادہ کر لیا' جسے انہوں نے زندگی کے آخری سانس تک نبھایا' اگرچہ وہ خود ایمان نہ لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریب ترین لوگوں پر واضح کر دیا تھا کہ اب رسالت کی حمایت اور تصدیق پر تعلقات موقوف ہیں۔

(۳) اگلے مرحلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾﴾ (الحجر)

''آپ کو جو حکم ملا ہے اسے کھول کر بیان کر دیجیے اور مشرکین سے اعراض کیجیے۔''

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے شرک کے خرافات اور اباطیل کا پردہ چاک کرنا اور بتوں کی حقیقت اور بے قدری کو واشگاف کرنا شروع کر دیا۔ ان کی پوجا کرنے والوں کی گمراہی کو دلائل سے واضح فرمایا۔

مکّہ ایک ایسی آواز سن کر جس میں مشرکین اور بت پرستوں کو گمراہ کہا گیا تھا' احساسِ غضب سے پھٹ پڑا اور شدید غم وغصہ سے پیچ وتاب کھانے لگا۔ گویا بجلی کا کڑکا تھا جس نے پُرسکون فضا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس لیے قریش اس اچانک پھٹ پڑنے والے ''انقلاب'' کی جڑ کاٹنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اس سے پشتینی رسم ورواج کا صفایا ہوا چاہتا تھا۔ چنانچہ پہلی کوشش میں قریش نے ابوطالب کی خدمت میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف احتجاجی سفارت کاری کی' جواب میں ابوطالب نے نرم لہجہ میں انہیں سمجھا بجھا کر بھیج دیا۔

دوسری کوشش انہوں نے آنے والے حاجیوں کو نبی کریم ﷺ سے دور رکھنے کے لیے کی۔ کچھ کفارِ مکّہ عازمین حج کے مختلف راستوں پر بیٹھ گئے اور وہاں سے ہر گزرنے والے کو نبی کریم ﷺ کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے آپؐ کے متعلق تفصیلات بتانے لگے۔ اس کام میں سب سے زیادہ پیش پیش ابولہب تھا۔ وہ حج کے ایام میں لوگوں کے ڈیروں اور عکاظ مجنہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں آپؐ کے پیچھے لگا رہتا۔ آپ ﷺ اللہ کے دین کی تبلیغ کرتے اور ابولہب پیچھے یہ کہتا کہ اس کی بات نہ ماننا' یہ جھوٹا بددین ہے۔ مزید یہ کہ آپ ﷺ پر ہنسی' مذاق' تحقیر' استہزاء اور تکذیب کے ذریعے اور ناروا تہمتوں اور گالیوں کے ذریعے وہ لوگ آپ ﷺ

اور آپؐ کے ساتھیوں کو بددل کر دینا چاہتے تھے۔

دوسری صورت میں آپ ﷺ کی تعلیمات کو مسخ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ آپؐ کے خلاف پروپیگنڈا اس کثرت سے کیا گیا کہ عوام کو آپؐ کی دعوت پر غور کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ محاذ آرائی کی تیسری صورت یہ تھی کہ لوگوں کو آپؐ کی طرف متوجّہ ہونے سے روکنے کے لیے لہو ولعب کا بازار گرم کیا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ......﴾ (لقمٰن:۶)

''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کھیل کی بات خریدتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں......''

محاذ آرائی کی چوتھی صورت یہ تھی کہ سودے بازیوں کے ذریعے اسلام اور جاہلیت کے درمیان کی راہ نکال لیں۔

جب انہوں نے دیکھا کہ یہ کارروائیاں اسلامی دعوت کی راہ روکنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہیں تو پھر ایک دفعہ ابولہب کی سربراہی میں ۲۵ سردارانِ قریش کی کمیٹی نے باہم مشورے اور غور وخوض کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کے خلاف ایک قرارداد منظور کی' یعنی یہ طے کیا گیا کہ اسلام کی مخالفت' پیغمبر اسلام ﷺ کی ایذا رسانی اور اسلام لانے والوں کو طرح طرح کے جور وستم اور ظلم وتشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے گی۔

پھر سے اس بات کو تازہ کر لیجیے کہ یہ جِدّ وجُہد تہجد کے حکم پر عمل پیرا ہونے اور کلمے کی دعوت کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ صرف خود ہی نہیں بلکہ اہلِ ایمان بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ انہی اہلِ ایمان کے خلاف یہ قرارداد پاس ہوئی تھی اور کفارِ مکّہ نے اس پر عمل درآمد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چنانچہ حضرت بلال ؓ گلے میں رسّی ڈال کر گلیوں میں پھرائے جاتے' گرم ریت پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا۔ عامر بن فہیرہ ؓ کو اتنا مارا جاتا کہ عقل جاتی رہتی۔ ابوفکیہہ ؓ کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں پہنائی جاتیں۔ خباب بن ارت ؓ کی کمر پر لوہے کا جلتا ہوا کڑا رکھ دیا جاتا' دہکتے ہوئے کوئلوں پر لٹا دیے جاتے' جسم کی چربی سے آگ بجھتی۔ حضرت زنیرہ ؓ کو ابوجہل نے اس قدر اذیت دی کہ بینائی جاتی رہی۔ تاہم ان کے صبر واستقامت پر اللہ تعالیٰ کے انعام کے طور پر بینائی لوٹ آئی۔ عمرو بن مول ؓ کو عمر بن خطاب مار

مار کر تھک جاتے۔ یاسر اور عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو ابوجہل گرمی میں شدید اذیت دیتا۔ آپ ﷺ ان کے پاس سے گزرتے تو صبر کی تلقین کرتے ہوئے جنت کی بشارت دیتے۔ حضرت یاسرؓ کی اہلیہ سُمیّہ بنت خباط رضی اللہ عنہا کو ابوجہل نے شرمگاہ میں نیزہ مار کر شہید کر دیا اور حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو چار سرکش اونٹوں کے ساتھ باندھ کر اونٹوں کو ایسے دوڑایا کہ ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ عثمان رضی اللہ عنہ بن عفان رضی اللہ عنہ کا چچا انہیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر دھونی دیتا۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جو امیر گھرانے کے خوبصورت نوجوان تھے' بے سروسامان گھر سے نکال دیے گئے۔ گرمی کی شدّت سے ان کے جسم کی کھال سانپ کی کینچلی کی طرح اُدھڑ گئی۔

رسول اللہ ﷺ پر دست درازیاں کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی گئی' طعن و تشنیع کا رویہ اختیار کیا گیا' آپ ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق دلوا دی گئی' نماز کی حالت میں اونٹنی کی غلاظت بھری اوجھڑی آپ ﷺ کی پیٹھ پر ڈال دی گئی۔ اُمیہ بن خلف آپ ﷺ سے بدزبانی کرتا' اسی بدبخت نے عقبہ بن ابی معیط کو نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور پر تھوکنے پر آمادہ کیا۔ ابولہب' اس کی بیوی اُمّ جمیل' حکم بن ابی العاص' عقبہ بن ابی معیط' عدی بن حمراء اور ابن الاصداء یہ لوگ نبی کریم ﷺ کے پڑوسی تھے اور آپؐ کو گھر کے اندر ستاتے تھے۔ ابوجہل نے نماز کی حالت میں آپؐ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کی' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے آپؐ کی حفاظت فرمائی۔ ان حالات میں آپ ﷺ نے حالات کا مقابلہ تصادم کی بجائے صبر سے کرنے کی پالیسی اپنائی۔ نبوت کے پانچویں سال کے وسط تک جور و ستم کا سلسلہ اتنا بڑھا کہ مسلمانوں کا مکّہ میں رہنا مشکل ہو گیا تو آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ اصحمہ نجاشی کے ملک حبشہ ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ ۱۲ مردوں اور چار خواتین نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی امارت میں یہ سفر کیا۔ دوسرا قافلہ جس نے حبشہ ہجرت کی یہ ۸۲ یا ۸۳ مردوں اور ۱۸ یا ۱۹ عورتوں پر مشتمل تھا۔ قریشِ مکّہ نے عمرو بن عاص اور عبداللہ بن ربیعہ کو بہترین تحفے اور ہدیے دے کر نجاشی کے پاس بھیجا تاکہ وہ ہجرت کر کے اس کے ملک میں آنے والوں کو واپس بھیج دے' لیکن ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

قریش نے ابوطالب کو آپ ﷺ کی پشت پناہی کرنے پر جنگ کی دھمکی دی۔ انہوں نے حالات کی نزاکت کو سمجھ کر کہا: بھتیجے! مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جو میرے بس سے باہر ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''چچا جان' خدا کی قسم! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ

دیں کہ میں اس کام کو اس حد تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں کہ یا تو اللہ اسے غالب کر دے یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں تو نہیں چھوڑ سکتا۔'' کُفّارِ مکّہ نے متعدد بار کوشش کی کہ آپ ﷺ کو جان سے مار دیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا' بلکہ ان کوششوں کے نتیجے میں اللہ نے حضرت حمزہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے کے مواقع پیدا کر دیے۔

قتل کا منصوبہ چھوڑ کر انہوں نے ظلم کی ایک اور سنگین راہ تجویز کی۔ باقاعدہ ایک معاہدہ کیا گیا کہ اہلِ مکّہ حضرت محمد ﷺ اور آپؐ کا ساتھ دینے والوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیں گے۔ نتیجے میں ابولہب کے سوا بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے سارے افراد شعب ابی طالب میں محبوس ہو گئے۔ ضروریاتِ زندگی سے آپؐ کو محروم رکھنے کی کوشش محرم ۱۰ نبوی تک جاری رہی۔ شعب ابی طالب کی محصوری ختم ہونے کے بعد کا سال غم کا سال ثابت ہوا۔ اس میں ابوطالب وفات پا گئے۔ ان کی وفات سے تین دن قبل آپ ﷺ کی غمگسار شریک حیات حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا وفات پا گئیں۔ ابوطالب کی وفات کے بعد کُفّارِ مکّہ نے آپؐ کو ایذا پہنچانے کی آخری حدوں کو چھو لیا۔ ان سے مایوس ہو کر آپؐ شوال ۱۰ نبوی میں مکّہ سے ۶۰ میل دور پیدل طائف تشریف لے گئے' لیکن طائف والوں کی بدسلوکی نے حزن والم اور رنج و غم سے اتنا دوچار کیا کہ دعائے مستضعفین آپؐ کی زبان پر جاری ہو گئی۔ بہرحال آپؐ واپس مکّہ تشریف لے آئے۔ مکّی زندگی کے آخری دور میں اسراء اور معراج کے واقعہ سے آپ ﷺ کو قوت دی گئی۔

جب مدینہ کے لوگوں کی ایک معتدبہ تعداد ایمان لے آئی تو رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دیا۔ کُفّارِ مکّہ نے آپؐ کے قتل کی تیاری کر لی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بھی مدینہ ہجرت کی اجازت دے دی۔ ۸ ربیع الاول ۱۳ نبوی کو آپؐ قبا پہنچے۔

مکّی دور کی یہ ادنیٰ سی جھلک آپ کے سامنے پیش کی گئی ہے۔ اس پورے دور میں اہلِ ایمان کے پاس کون سی دولت تھی جس سے ثباتِ نفس کے علاوہ مشکل مواقع پر بھی اس سے کام نکال رہے تھے؟ وہی تہجد کی نماز بالقرآن تھی۔ وہ قرآن جسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ چنانچہ اس کا مشاہدہ اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب مہاجرین حبشہ کو واپس لانے والوں نے شاہ حبشہ اور اس کے درباریوں کو ہم خیال بنانے کے لیے ان پر تحفوں اور ہدیوں کی بارش کر دی۔ اس سارے مال کے مقابلے میں سورۂ مریم کی تلاوت بھاری پڑ گئی۔

اب ہم مدنی زندگی کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں۔ اس کے بھی تین مرحلے ہیں:

(۱) پہلا مرحلہ: اس میں فتنے اور اضطرابات برپا کیے گئے‘ اندر سے رکاوٹیں کھڑی کی گئیں اور باہر سے دشمنوں نے اہلِ ایمان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے چڑھائیاں کیں۔ یہ مرحلہ صلح حدیبیہ ذی قعدہ ۶ھ پر ختم ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا مرحلہ: اس میں بت پرست قیادت کے ساتھ صلح ہوئی۔ یہ فتح مکّہ ۸ھ پر منتہی ہوتا ہے۔ یہی مرحلہ شاہانِ عالم کو دعوتِ دین پیش کرنے کا بھی مرحلہ ہے۔ مکّہ فتح ہوا تو نبی اکرم ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپؐ وہاں رکھے ہوئے بُتوں کو چھڑی سے گراتے جاتے تھے اور یہ آیت مبارکہ تلاوت فرماتے تھے: ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۭ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝۸۱﴾ (بنی اسرائیل) یعنی وہ مشن جس کی ابتدا تہجد کے حکم کے ساتھ ہوئی‘ زھوقِ باطل پر مکمل ہو گیا۔

(۳) تیسرا مرحلہ: اس میں خلقت اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوئی۔ یہی مرحلہ مدینہ میں قوموں اور قبیلوں کے وفود کی آمد کا بھی ہے۔ یہ مرحلہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے اخیر تک یعنی ربیع الاوّل ۱۱ھ تک پھیلا ہوا ہے۔

مدنی زندگی کے پہلے مرحلے کے دوران چھوٹی چھوٹی لاتعداد لڑائیوں کے علاوہ غزوۂ بدر‘ غزوۂ اُحد اور غزوۂ احزاب جیسے معرکے بھی پیش آئے‘ جن میں اہلِ ایمان نے کافروں کو قتل بھی کیا اور خود بھی شہید ہوئے۔ خود نبی کریم ﷺ کو جنگ میں تلوار کے زخم سہنے پڑے جن کی وجہ سے آپؐ کا خون مبارک بہا اور آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ اس ساری ہنگامہ خیز جدّوجہد کے نتیجے میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے مل کر جزیرہ نمائے عرب میں مکمل انقلاب برپا کر دیا اور بعد میں خلفائے راشدینؓ کے دور میں پوری دنیا پر اسلام غالب دین کے طور پر نافذ کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے دن سے جو زادِ راہ آپ ﷺ کو اور آپؐ کے اصحاب کو دیا گیا وہ تہجد بالقرآن تھا۔ اوپر جو کچھ سیرت کی جھلک پیش کی گئی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمیں یہ بات واضح ہو جائے کہ تہجد گزار ہستیوں کے دن کن کاموں میں گزرتے ہیں۔ ہم کلام پاک میں تہجد گزاروں کے یہ اوصاف تلاوت کرتے ہیں:

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۡ وَّمِمَّا

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۱۶﴾ (السجدۃ)

’’ان کے پہلو سونے کی جگہوں سے جدا رہتے ہیں‘ اپنے رب کو خوف اور طمع سے پکارتے ہیں اور ہم نے انہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔‘‘

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝۱۷ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۱۸﴾ (الذّٰریٰت)

’’وہ رات کو تھوڑا سوتے تھے۔ اور صبح کے اوقات میں بخشش چاہتے تھے۔‘‘

اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ لوگ بے خوابی کے مرض کا شکار ہو جاتے ہیں‘ بلکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے ربّ کا یہ حکم ہے کہ وہ رات کو اُٹھیں اور اس کے حضور ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴﴾ (الفرقان) ’’اور وہ لوگ راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام کرتے ہوئے‘‘ کی صورت میں وقت گزاریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ’’اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ‘‘ کے مصداق اہلِ ایمان کا جس ہستی کے ساتھ یہ تعلق استوار ہو گیا ہے اُس کی جناب میں عرض وگزارش کرنے کا بہترین وقت رات کی گھڑیاں ہیں‘ جو تنہائی میں میسر آتی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دن کے اوقات میں دین اسلام کو سربلند کرنے کی وہ کارروائیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ اور ان کے اہل وعیال‘ ان کے مال و اسباب اور دنیاوی مفادات دشمن کے نشانے پر ہیں۔ ایک ہمہ جہت کشمکش ہے جو نظامِ باطل کے خلاف جاری ہے۔ وہ درد ہے جو انسانیت کے راہِ راست پر نہ آ کر جہنّم کا ایندھن بننے کی وجہ سے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ یاد کیجیے صحابی رسولؐ عبداللہ بن مسعودؓ نبی اکرم ﷺ کی فرمائش پر تلاوت کرتے ہوئے جب اس آیت مبارکہ پر پہنچے:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰي هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ (النساء)

’’تو اُس دن کیا صورت حال ہو گی جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبی ﷺ!) آپ کو لائیں گے ہم ان پر گواہ بنا کر۔‘‘

تو آپ ﷺ نے اپنے صحابی کو مزید تلاوت سے روک دیا۔ انہوں نے نظر اٹھا کے دیکھا تو آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک آنسوؤں سے تر تھا۔

یہ دن کے شہسواروں کے لیے حکم ہے۔ وہ رات کو اٹھ کر ہر چیز سے کٹ کر صرف اللہ سے جڑ جائیں اور اُس کے کلام سے قوت اور راہنمائی حاصل کریں۔ حالات کی سختی کا گلہ شکوہ صرف اپنے مالک کے سامنے پیش کریں۔

﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾ (آلِ عمران)

’’وہ صبر کرنے والے ہیں‘ وہ سچے ہیں‘ حکم بجالانے والے ہیں‘ خرچ کرنے والے ہیں‘ اور سحری کے وقت گناہ بخشوانے والے ہیں۔‘‘

قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے ان الفاظ کے معانی سمجھئے۔ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کی سیرت کے یہ پہلو کھول کر رکھ رہا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ان اشخاص کی سیرت و کردار کا آئینہ بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

’’نیکی کچھ یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو‘ بلکہ اصل نیکی تو اُس کی ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر‘ قیامت کے دن پر‘ فرشتوں پر‘ سب کتابوں پر‘ پیغمبروں پر‘ اور دے مال اس کی محبت کے باوجود رشتہ داروں‘ یتیموں‘ محتاجوں‘ مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں‘ اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ‘ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کو جب کوئی عہد کریں‘ اور صبر کرنے والے سختی میں‘ تکلیف میں اور لڑائی کے وقت۔ یہی لوگ ہیں سچے اور یہی ہیں پرہیزگار۔‘‘

گویا سچائی اور پرہیزگاری نیکی کا ایک ایسا کردار ہے جو ایمان‘ انسانی ہمدردی‘ فرائضِ دین کی ادائیگی‘ عہد کی وفاداری اور مشکلات میں صبر سے تشکیل پاتا ہے۔

سورۃ الحجرات میں سچوں کی سیرت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’ایمان والے تو بس وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول پر‘ پھر شک میں نہ پڑے اور انہوں نے اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ ہیں سچے۔‘‘

سورۃ الاحزاب میں فرمایا:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾

’’ایمان والوں میں سے کتنے مرد ہیں کہ انہوں نے جو اللہ سے عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھایا‘ پھر کوئی تو ان میں اپنا ذِمہ پورا کر چکا (یعنی اپنی جان کا نذرانہ پیش کر چکا) اور کوئی ان میں سے منتظر ہے (کب اس کو یہ نذرانہ پیش کرنے کا موقع ملتا ہے) اور انہوں نے (اپنے عہد میں) کوئی تبدیلی نہیں کی۔‘‘

سورۃ الزمر میں بندۂ قانت کے اوصاف بیان فرمائے:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۗ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۗ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۹﴾﴾

’’بھلا ایک بندہ جو بندگی (عبادت) میں لگا ہوا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کی حالت میں‘ آخرت (کے عذاب) سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار رہتا ہے۔ تو کہہ دیجیے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ یاددہانی تو وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔‘‘

’’قانت‘‘ وہ لوگ ہیں کہ جب وہ رات کی نماز میں قرآن میں جہنّم کے عذاب کا ذکر تلاوت کرتے ہیں تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور وہ اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں‘ اور جب جنّت کی نعمتوں کے ذکر والی آیات تلاوت کرتے ہیں تو ان کے دل اس کے پانے میں حریص ہو جاتے ہیں اور اس کے لیے اپنے رب کی رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے جنّت کی نعمتوں کو

اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور دوزخ کو بھی۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ایک نوجوان انصاری صحابیؓ سے پوچھا: ((کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا حَارِثَۃُ؟)) ''اے حارثہ! تم نے کس حال میں صبح کی؟'' تو انہوں نے عرض کیا: اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حَقًّا ''(یارسول اللہ ﷺ!) میں نے ایک حقیقی مؤمن کی صبح کی ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس کی دلیل کیا ہے؟'' تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اس حال میں صبح کی کہ گویا اپنے رب کا عرش اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اور گویا اہلِ جنّت کو جنّت کے مزے لوٹتے اور اہل جہنّم کو مبتلائے عذاب دیکھ رہا ہوں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ایک ایسا بندہ ہے جس کا دل اللہ نے منور کر دیا ہے''۔ اسی طرح ایک جلیل القدر صحابی کا قول ہے کہ میں آخرت کے مناظر کو دیکھوں تو میرے ایمان میں ذرّہ برابر زیادتی نہ ہوگی۔ گویا دنیا ہی میں مجھے عین الیقین حاصل ہے۔ جنہیں آخرت کے بارے میں یہ یقین حاصل نہیں وہ چاہے چاند پر قدم رکھ دیں تب بھی عقل مند نہیں ہو سکتے۔

غلبہ واقامتِ دین کے کارکن سحری میں اپنے رب سے بخشش چاہتے ہیں۔ باطل نظام کا غلبہ ایسے ہی ہے جیسے فتنوں کی آگ کے شعلے جو ہر طرف بھڑک رہے ہیں۔ ان فتنوں کے شعلوں کی تپش سے وہ بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ دعوت وتبلیغ اور مجادلہ حسنہ میں کہیں چوک لگ سکتی ہے' وہ غلطیوں پر بضد نہیں رہتے ہیں۔ ان کی تلافی اور اپنے رب سے معافی کے طلبگار بن کر رہتے ہیں' اس حال میں کہ انہیں معلوم ہے کہ رات کے آخری پہر اُن کا رب آسمانِ دنیا پر جلوہ افروز ہو کر ہاتھ بڑھاتا ہے کہ ہے کوئی مانگنے والا کہ اس کو دوں! ہے کوئی بخشش چاہنے والا کہ اس کو بخش دوں! اللہ کے یہ بندے ان مواقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

آخر میں آغازِ وحی میں نازل ہونے والی سورۃ المدثر اور سورۃ المزمل کی وہ آیات جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی کبریائی کا نظام قائم کرنے کے لیے کمربستہ کھڑے ہونے کا حکم ہے' ان پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ غلبہ واقامتِ دین کے کارکن کے لیے بہترین زادِراہ کیا ہے۔ سورۃ المدثر میں ''اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو!'' کے بعد فرمایا:

﴿وَ ثِیَابَکَ فَطَہِّرۡ ﴿۴﴾ وَ الرُّجۡزَ فَاہۡجُرۡ ﴿۵﴾ وَ لَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَکۡثِرُ ﴿۶﴾ وَ لِرَبِّکَ فَاصۡبِرۡ ﴿۷﴾﴾ (المدثر)

''اپنے کپڑے پاک رکھو' اور گندگی سے دور رہو' اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے

لیے' اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔''

جس شہر اور معاشرے میں رسول اللہ ﷺ کو اپنے رب کی ہر پہلو سے کبریائی اور بڑائی کو بولنے کا حکم دیا گیا تھا وہ کفر وشرک کا گڑھ تھا۔ مکّہ والے اس صنم کدے کے مجاور تھے جس کی وجہ سے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ان کی بات بنی ہوئی تھی اور معیشت میں اجارہ داری حاصل تھی۔ ایسی مزاحم قوتوں کے مقابلے میں باطل کی نفی کر کے اللہ کی کبریائی کا نعرہ لگانا ایک غیر معمولی مشن تھا جو آپ ﷺ کو سونپا گیا۔ اس کام کو کرنے کے لیے جس سیرت وکردار کی ضرورت تھی' چار چھوٹی چھوٹی معدودے چند الفاظ پر مشتمل آیات میں ان کو بیان کر دیا گیا:

''(۱) اپنے لباسوں کو نجاست سے پاک رکھو' کیونکہ جسم ولباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ ﷺ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف اخلاق اور عقائد کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت اور نظافت کے بھی ابتدائی تصوّرات تک سے خالی تھا۔'' (تفہیم القرآن)

طہارت وپاکیزگی سے وہ لوگ کس قدر دُور تھے' آپ ﷺ کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے جو آپؐ نے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں فرمایا تھا۔ طائف کے سفر سے واپسی پر مطعم بن عدی نے مکّہ میں داخلہ کے لیے نبی کریم ﷺ سے جو تعاون کیا تھا' رسول اللہ ﷺ نے اس کا یہ حسنِ سلوک کبھی فراموش نہ فرمایا۔ چنانچہ بدر میں کُفّارِ مکّہ کی ایک بڑی تعداد قید ہو کر آئی اور بعض قیدیوں کی رہائی کے لیے جبیر بن مطعم آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ الْمُطْعِمُ بْنُ عَدِیٍّ حَیًّا ثُمَّ كَلَّمَنِیْ هٰؤُلَاءِ النَّتْنٰى لَتَرَكْتُهُمْ لَهٗ))

(صحیح البخاری)

''اگر (تمہارا والد) مطعم بن عدی زندہ ہوتا' پھر ان بدبودار لوگوں کے بارے میں مجھ سے بات کرتا تو میں اُس کی خاطر ان سب کو چھوڑ دیتا۔''

چنانچہ دین کی طرف دعوت دینے کے لیے ضروری ہے کہ داعی کا لباس اور اس کی ظاہری کیفیت ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزّت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اس میں فخر وغرور یا ٹھاٹھ باٹھ اور شان وشوکت نہیں چھلکنا چاہیے۔ لباس دیکھ کر لوگ شخصیت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔

مزید برآں اس آیت مبارکہ میں یہ ہدایت بھی پوشیدہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو' اپنے

اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے‘ خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو یا اخلاق و اعمال کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش طرح طرح کی گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ معاشرت اور معیشت ان سے آلودہ ہے‘ سیاست مدن پاک صاف نہیں ہے۔ ان سب کی آلودگیوں سے اپنے دامن کو پاک رکھو۔

﴿وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۝٦﴾ کا مطلب ہے تمہاری عطا و بخشش‘ سخاوت اور حسن سلوک محض اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ کوئی شائبہ بھی اس خواہش کا نہیں ہونا چاہیے کہ احسان کے بدلے میں زیادہ تو دور کی بات ہے برابر کا فائدہ بھی اپنی ذات کے لیے حاصل کرو گے۔ مزید یہ کہ اس کام کو اپنی نگاہ میں کبھی بڑا عمل نہ سمجھو‘ یعنی اس فریضہ کی ادائیگی کو کبھی بھی اللہ پر احسان نہ سمجھو‘ بلکہ اپنے اوپر اللہ کا احسان سمجھو کہ اس نے آپ کو اُس خدمت کے قابل سمجھا ہے۔

آخری بات سمجھائی گئی کہ یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تمہاری اپنی قوم اور ملک تمہارا دشمن ہو جائے گا۔ لیکن اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جس بصیرت سے آپ کو نوازا ہے اس میں صبر کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مناسب وقت آنے سے پہلے کسی شارٹ کٹ کے متلاشی نہ بنو اور جب کسی کام کا وقت آ جائے تو اس کے لیے اقدام میں تاخیر نہ ہونا چاہیے۔ اسی کی خاطر جھیلو۔ کسی خوف‘ طمع‘ کسی کی دوستی‘ کسی کی دشمنی اس راستے میں حائل نہیں ہونی چاہیے۔ تمہارے اجر کا ضامن صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہونا چاہیے۔ خدائی نظام کا انقلاب برپا کرنے والوں کے لیے یہ عظیم ہدایات ہیں جو ابتدا میں ہی انہیں دے دی گئی ہیں۔ دوسرا حکم جو دیا گیا وہ یہ تھا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ۝۱ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ۝۲ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ۝۳ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ۝۴ اِنَّا سَنُلۡقِىۡ عَلَيۡكَ قَوۡلًا ثَقِيۡلًا ۝۵﴾

’’اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے ہو جایئے مگر کم۔ آدھی رات تک یا اس میں سے کچھ کم کر لو۔ یا اس سے کچھ بڑھا لو اور قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔ ہم آپؐ پر ایک بھاری کلام (ذِمہ داری) نازل کرنے والے ہیں۔‘‘

ان آیات میں جہاں قیام اللیل میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس کی حکمت بھی بیان فرما دی کہ ایک بھاری ذِمہ داری آپؐ پر ڈالی جا رہی ہے جس کا بار اٹھانے کے

لیے آپؐ میں اس کے تحمل کی طاقت پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور یہ طاقت اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ راتوں کو اپنا آرام چھوڑ کر نماز کے لیے اُٹھیے‘ آدھی آدھی رات یا کچھ کم و بیش اس نماز میں قرآن پاک کی تلاوت کیجیے۔ بھاری کلام اس لیے ہے کہ اس کے احکام پر عمل کرنا‘ اس کی تعلیم کا نمونہ بن کر دکھانا‘ اس کی دعوت کو لے کر ساری دنیا کے مقابلے میں اٹھنا‘ اس کے مطابق عقائد و افکار‘ اخلاق و آداب اور تہذیب و تمدن کے پورے نظام میں انقلاب برپا کر دینا ایک ایسا کام ہے جس سے بڑھ کر کسی بھاری کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ رات کا یہ وقت ان مضامین کی حکمتوں کو سمجھنے اور عمل کے لیے نفس کی تربیت کا بہترین وقت ہے۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں الرحیق المختوم‘ تفسیر عثمانی اور تفہیم القرآن سے مدد لی گئی ہے۔

❁❁❁

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی فکر انگیز تالیفات

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب
کے مراحل و مدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیرُ الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اتحادِ اُمّت اور اقامتِ دین

عبدالرؤف

عربی محاورہ ہے ''تُعرَفُ الاَشیاءُ بِاَضدَادِھَا'' کہ اشیاء کی پہچان ان کی ضد سے ہوتی ہے۔ جسے توحید کو سمجھنا ہو تو اُسے شرک کا سمجھنا ضروری ہے۔ آخرت کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کی ضد دنیا کی حقیقت کو سمجھنا ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح لفظ اتحاد کی معرفت کے لیے اس کی ضد افتراق سے کماحقہ واقف ہونا ضروری ہے‘ جس کے لیے فرقہ یا تفرقہ کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔

موجودہ صورتِ حال میں اگر تفرقہ کی مختلف سطحوں کا جائزہ لیا جائے تو سب سے بڑا تفرقہ جو اُمّت کی سطح پر خلافت کا ادارہ ٹوٹنے کے بعد گزشتہ صدی کے دوران میں نمودار ہوا وہ یہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ مختلف ممالک میں تقسیم ہوگئی اور اس تقسیم کی بنیاد نسلی قومیت پر رکھی گئی۔ اس حوالے سے صرف ایک استثناء ہے اور وہ ہے مملکت خداداد پاکستان‘ جس کا قیام مسلم قومیت کی بنیاد پر عمل میں آیا۔ باقی مسلمان ممالک سعودی‘ مصری‘ یمنی‘ شامی‘ عراقی‘ ایرانی یا ترک بن گئے‘ جس کے نتیجہ میں اُمّتِ واحدہ پچاس (۵۰) سے زیادہ قومی‘ نسلی اور لسانی فرقوں میں بٹ گئی۔

اس سے نچلی سطح پر مذہبی عقائد وعبادات کی بنا پر جو تفرقہ پہلے صرف اہلِ تشیع اور اہلِ سُنّت کی حد تک تھا اور اتنا زیادہ گہرا بھی نہیں تھا‘ اس میں بھی شدّت آگئی۔ مزید برآں برصغیر پاک وہند کی مخصوص مذہبی فضا کے پیش نظر اہلِ سُنّت کے مختلف گروہوں کے اندر بھی کشیدگی کی فضا میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اسی طرح مزید نیچے جا کر گزشتہ صدی کے دوران میں دو بڑی طاقتوں کی سرد جنگ کے نتیجے میں جس طرح عالمی سطح پر دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم ہوئی اسی طرح اسلامی ممالک کے اندر بھی یہ تقسیم اپنی انتہا کو پہنچی۔ بعد ازاں جہادِ افغانستان‘ انقلابِ ایران اور نائن الیون کے بعد یہ تقسیم فنڈا منٹلزم اور سیکولرزم کی شکل میں مزید گہری ہوتی چلی گئی اور آنے والا ہر دن اس تقسیم کو بڑھانے کا باعث بنتا چلا گیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ گزشتہ دہائی کے دوران کچھ مغربی ممالک میں توہینِ رسالت‘ توہینِ قرآن اور اسلاموفوبیا کے عنوان سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک

باقاعدہ منصوبہ کے تحت بنائی گئی فضا بھی ہے۔ اس مسموم فضا کے اثرات مسلمان ممالک پر بھی پڑے جس کے نتیجہ میں یہاں بھی سیکولر اور فنڈامنٹلسٹ کی تقسیم گہری ہوتی چلی گئی۔ اس آگ کو بھڑکانے میں ایک اہم کردار ہمارے بکاؤ میڈیا کا بھی ہے جو معاشرے کے اصل مسائل سے پہلو تہی کرتے ہوئے تفرقاتی مسائل پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔ ہمارا میڈیا عوام کے سامنے اسلام‘ دینی جماعتوں اور دینی اداروں کے اکابرین کے کردار کو مسخ کر کے پیش کرتا ہے اور اس کے مقابلے میں اسلام مخالف نظریات کا باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ پرچار کرتا ہے۔

تفرقہ‘ انتشار اور باہم سر پھٹول کی جس صورتحال سے آج ہم دوچار ہیں اس سے آج کی ترقی یافتہ قومیں بھی ایک عرصہ تک دوچار رہی ہیں۔ عیسائیوں کے یہودیوں پر ظلم وتشدد کی ایک طویل تاریخ ہے‘ جبکہ عیسائیوں کے مذہبی فرقوں کی آپس میں جنگ بھی ایک دور میں بڑی شدّت کے ساتھ جاری رہی ہے۔ اسی طرح گزشتہ صدی میں برپا ہونے والی دونوں عظیم جنگوں میں حصّہ لینے والے زیادہ تر ممالک بھی عیسائی ہی تھے۔ ۱۹۴۲ء میں جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے کچھ عرصہ بعد لیگ آف نیشنز (League of Nations) وجود میں آئی۔ اس کی ناکامی کے بعد بڑی طاقتوں کے سربراہ دوبارہ سر جوڑ کر بیٹھے اور تنظیم اقوام متحدہ (UNO) کا ادارہ وجود میں آ گیا۔ بظاہر مقصد تو یہی تھا کہ اس کے جھنڈے تلے تمام اقوامِ عالم کو متحد کیا جائے اور امن قائم کیا جائے‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اصل مقصد چند بڑی طاقتوں کے سیاسی و معاشی مفادات کا تحفظ ہے۔ ان طاقتوں نے آپس میں یہ طے کر لیا ہے کہ اپنے تمام معاملات آپس ہی میں میز پر بیٹھ کر طے کرنے ہیں اور کمزور ممالک کے مفادات کو مل بیٹھ کر کھانا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان ممالک اور خصوصاً عالمِ اسلام کو آپس میں بھی لڑانا ہے اور انہیں سیاسی‘ معاشی اور معاشرتی ہر لحاظ سے اپنے تابع رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اپنے اس مقصد میں وہ ابھی تک پوری طرح کامیاب ہیں۔

جس طرح سطورِ بالا میں تفرقہ کی تین سطحیں ہمارے سامنے آئی ہیں اسی طرح قرآن حکیم کی روشنی میں تفرقہ کی بھی تین بنیادی وجوہات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں سب سے پہلی اور بنیادی وجہ شرک باللہ ہے‘ جس کے متعلق سورۃ الروم میں فرمایا گیا:

﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍ

بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ﴿۳۲﴾

''سب رجوع ہو اُسی کی طرف اور اُسی سے ڈرتے رہو اور قائم رکھو نماز اور مت ہو شرک کرنے والوں میں۔ جنہوں نے پھوٹ ڈالی اپنے دین میں اور ہو گئے ان میں بہت فرقے۔ ہر فرقہ جو اُس کے پاس ہے اس پر خوشی منا رہا ہے۔''

دوسری بڑی وجہ قرآن سے دُوری ہے‘ جس کی وضاحت سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ میں اس انداز سے کی گئی کہ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور مضبوط پکڑو اللہ کی رسّی کو سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو‘‘۔ تیسری اس سے بھی بڑی وجہ دین کا مغلوب ہونا بیان کی گئی۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں فرمایا کہ ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ط﴾ ''یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو‘‘۔

ان قرآنی احکام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شرک سے بچ کر توحید پر قائم رہنے اور قرآن سے مضبوط تعلق قائم رکھنے کے نتیجہ میں ہی اقامتِ دین کی منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ البتہ بنظر غائر جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ تعلق مع اللہ اور تعلق بالقرآن پر صحیح طور پر جازم رہنے کے لیے دین کا غالب ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ یہ اتنی بڑی حقیقت ہے کہ نزولِ قرآن کے آغاز ہی میں سورۃ المدثر میں واضح انداز میں فرما دیا گیا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ''اے لحاف میں لپٹنے والے (نبی ﷺ!) اُٹھیے‘ پس خبردار کیجیے‘ اور اپنے ربّ ہی کی بڑائی بیان کیجیے‘‘۔ اسی طرح سورۃ الشوریٰ بھی نزولی ترتیب میں سورۃ الروم اور سورۃ آلِ عمران سے پہلے آتی ہے جس میں تفرقہ کی اصل وجہ اقامتِ دین کا نہ ہونا بیان کی گئی ہے‘ جبکہ شرک باللہ اور مہجوریٔ قرآن کا ذکر بالترتیب سورۃ الروم اور سورۂ آلِ عمران میں آیا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کی کتاب کے ساتھ اہل ایمان کا تعلق نسلی عقیدے اور کچھ مراسمِ عبودیت کی ادائیگی کی حد تک تو دورِ مغلوبیت میں بھی قائم رہتا ہے لیکن اللہ کے ساتھ حقیقی تعلق اور قرآن مجید کے تمام حقوق کی ادائیگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک صحیح معنوں میں اللہ کا دین اجتماعی سطح پر غالب و نافذ نہیں ہو جاتا۔ درحقیقت غلبۂ دین ہی ایک ایسی شاہ کلید ہے جس کے ذریعہ کتاب اللہ پر لگائے گئے تمام تالے عمل کے میدان میں کھل سکیں گے اور بنی نوعِ انسان کے سامنے اللہ کے دین کی درست تصویر آسکے گی۔

آج مسلم دنیا میں بہت سی جماعتیں اور ادارے نظری‘ فکری اور عقیدہ کی سطح پر توحید کو پھیلانے اور شرک کو مٹانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اسی طرح جماعتوں‘ اداروں‘ انجمنوں‘ تنظیموں اور دینی مدارس کی ایک کثیر تعداد قرآن حکیم کے حفظ و ناظرہ اور ترجمہ و تفسیر کی حد تک خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس سب کے باوجود عمومی طور پر پوری دنیا اور خصوصی طور پر مملکت خداداد پاکستان کی سطح پر دیکھا جائے تو معاشرے میں بگاڑ اور اخلاقی تنزل میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور تفرقہ کی جن تین سطحوں کا آغاز میں ذکر کیا گیا تھا‘ اس میں بھی مزید شدت آ رہی ہے۔

ہمارے بعض دوست انتہائی نیک نیتی اور اخلاص کے ساتھ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ دین کے مختلف گوشوں میں جو جزوی نوعیت کے کام ہو رہے ہیں وہ بھی اقامتِ دین کی جِدّوجُہد کا حصہ ہیں‘ لہٰذا غلبۂ دین کے لیے جِدّوجُہد کرنے والی جماعتوں اور ان سے منسلک افراد کو کسی قسم کے تکبر اور نخوت میں مبتلا ہوئے بغیر ان کے کردار کو تسلیم کرنا چاہیے تاکہ معاشرے میں تشتت و انتشار پیدا نہ ہو۔ بادیٔ النظر میں یہ بہت اچھی سوچ معلوم ہوتی ہے لیکن مناسب ہوگا اگر تھوڑا سا گہرائی میں جا کر اس کا جائزہ لیا جائے۔ ہماری اکثر مذہبی جماعتیں‘ ادارے اور مدارس جو کام کر رہے ہیں اس کی اہمیت اس صورت میں تو مسلّم ہے جب خلافت کا ادارہ موجود ہو‘ یا پھر یہ کہ ہم مغلوب ہوں اور ہمارے اوپر کسی کافر قوم کا غلبہ ہو۔ ان دونوں صورتوں میں تو یہ کام قابلِ تحسین گردانا جائے گا‘ لیکن ۱۹۲۴ء میں خلافت کا ادارہ ٹوٹنے اور ۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد حالات مختلف صورت اختیار کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب حفاظتِ دین کے لیے محض خدمتِ دین کے طریقے پر عمل پیرا ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا‘ بلکہ اصل اور اہم ترین کام جسے ہمارے اسلاف نے ''اَھَمُّ الواجبات‘‘ یا ''اَھَمُّ الفرائض‘‘ کا نام دیا ہے وہ غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّوجُہد ہے۔

آج پاکستان کے اندر جس وسیع پیمانے پر دین کے جزوی کاموں کا جال پھیلتا چلا جا رہا ہے‘ تفرقہ اور انتشار اتنا ہی بڑھتا جا رہا ہے۔ مختلف مسالک کے درمیان جو فرقہ وارانہ منافرت پہلے علمی سطح کی محدود تھی اب وہ بڑھتے بڑھتے عملی کشیدگی کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس کے مقابلے میں غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کرنے والی جماعتیں جو اس وقت تعداد میں اگرچہ بہت کم ہیں لیکن ملکی سطح پر اتحاد و اتفاق کے حوالے سے ان کا کردار نہایت اہم ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال ''ملّی یکجہتی کونسل‘‘ ہے۔

وطنِ عزیز میں اتحاد و اتفاق کے حوالے سے تنظیم اسلامی کے کردار کو دیکھا جائے تو نظری طور پر پہلے دن سے ہی یہ طے کر دیا گیا تھا کہ: ’’تنظیم اسلامی معروف معنوں میں نہ کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ ہی کوئی مذہبی فرقہ‘ بلکہ ایک خالص اصولی اسلامی انقلابی جماعت ہے‘ جو سب سے پہلے پاکستان اور بعدازاں پوری دنیا میں نظامِ خلافت کو قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔‘‘

تنظیم اسلامی نے اتحاد و اتفاق کی طرف اس پہلو سے بھی پیش قدمی کی ہے کہ وہ دوسری دینی جماعتوں کی مانند الیکشن میں حصّہ نہیں لیتی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ کسی جماعت کی حریف نہیں ہے۔ اسی طرح جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تنظیم اسلامی کوئی مذہبی فرقہ یا مسلک نہیں ہے تو ہماری طرف سے یہ دعویٰ مزید مؤکد ہو جاتا ہے کہ تنظیم کے پیش نظر کسی مخصوص فرقہ یا مسلک کی تبلیغ نہیں ہے۔ رفقاءِ تنظیم کو بھی یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ تنظیم میں رہ کر اپنے فقہی مسلک پر عمل تو ضرور کریں لیکن اس کی تبلیغ و اشاعت نہ کریں۔ امت میں آج جو مسلکی اختلافات ہیں ان کی تاریخ بہت قدیم ہے اور وہ ہیں بھی زیادہ تر فروعی نوعیت کے۔ اگر دوسری جماعتیں بھی یہی روش اختیار کر لیں تو وہ بھی اتحادِ اُمّت کا ذریعہ بنیں گی۔ اس کے لیے عملی طور پر بانی تنظیم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے مختلف مواقع پر نہ صرف تمام مذہبی جماعتوں کے سرکردہ علماء بلکہ سیکولر اور لبرل عناصر کو بھی ایک سٹیج پر بٹھایا۔ اسی کی وجہ سے تمام شعبہ ہائے زندگی کے افراد اُن کی عزّت بھی کرتے تھے اور تنظیم اسلامی کے اتحاد بین المسلمین کے کردار کو سراہتے تھے۔ تنظیم اسلامی کا یہ کردار ادا کرنے کی اصل اور بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس کے پیش نظر غلبہ و اقامتِ دین کی جِدّ و جُہد کا ایک بہت عظیم مقصد ہے۔ جب تک تنظیم کے رفقاء کا اس مقصد کے ساتھ گہرا تعلق قائم رہے گا‘ ان کا کردار اس معاشرے میں کلیدی نوعیت کا رہے گا۔ اس کی ایک واضح مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

ہمارے ہاں جو فرقے یا مسالک وجود میں آئے ان کی آپس میں کوئی بہت بڑی جنگیں نہیں ہوئیں بلکہ وہ سب زیادہ سے زیادہ باہم مناظروں تک محدود رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے اوپر اپنی بے شمار خرابیوں سمیت خلافت کی چھتری موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں آج پوری اُمّت میں صرف دو حقیقی فرقے شیعہ اور سُنّی موجود ہیں لیکن افتراق اور انتشار اپنی آخری حدود کو چھو رہا ہے۔ دوسری طرف عیسائیوں نے اپنے دورِ مغلوبیت میں اس قدر باہمی جنگ و جدال کیا کہ الامان والحفیظ! آج صرف امریکہ میں عیسائیوں کے کم و بیش تین ہزار فرقے موجود ہیں جو

مختلف ناموں سے اپنے اپنے گرجا گھروں میں مذہبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن شدید اختلافات کے باوجود آپس میں لڑتے نہیں ہیں۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اِس وقت ایک غالب قوم ہیں اور جب کوئی قوم غالب ہوتی ہے تو اس کے پیش نظر بڑے مقاصد ہوتے ہیں جس کے لیے چھوٹے اختلافات دب کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا غلبۂ دین کے لیے جِدّ و جُہد کرنے والی جماعتوں اور ان سے منسلک افراد کے پیشِ نظر اس وقت سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ وہ موجودہ افتراق و انتشار سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے اپنے مقصد کے ساتھ جڑے رہیں اور اس دعوت کو معاشرے کے دوسرے طبقات تک پورے شدّ و مدّ اور محنت و عرق ریزی سے پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔ جب تک عوام الناس کے سامنے ان کا اصل مقصدِ زندگی واضح انداز میں نہیں آئے گا اس وقت تک معاشرے سے بے چینی ختم نہیں ہو سکے گی۔

وہ مقصد یہی ہے جو قرآن حکیم کے تین مقامات کی روشنی میں اس تحریر کے آغاز میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ (۱) شرک باللہ کی تمام شکلوں سے بچا جائے‘ (۲) قرآن حکیم کے ساتھ تمسک اختیار کیا جائے اور اسے اپنا راہبر و رہنما مانا جائے‘ (۳) اقامتِ دین و غلبۂ دین کی عظیم جدّ و جُہد سے جڑا جائے۔ یہی وہ مبارک جدّ و جُہد اور نبی اکرم ﷺ کی سب سے عظیم سُنّت ہے جس کی ادائیگی آپؐ نے نزولِ وحی سے اس دُنیا سے تشریف لے جانے تک مسلسل اور پیہم کی۔ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس جِدّ و جُہد کو اس شان کے ساتھ جاری رکھا کہ چند سالوں کے اندر اسلام اُس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر غالب ہو گیا۔ عرب کے وہ بدو جو معمولی باتوں پر سینکڑوں سال تک لڑتے رہتے تھے‘ آپس میں اس طرح شیر و شکر ہو گئے کہ دنیا میں اس سے بڑا کوئی بھائی چارہ‘ محبّت اور الفت کا مظہر اس سے قبل کبھی دیکھا ہی نہیں گیا تھا۔ یہ خلافت کے ادارے ہی کا کمال تھا کہ دنیا میں عرب و عجم اور گورے و کالے کی تقسیم ختم ہو گئی۔ لیکن یہی مسلمان جب اپنے مقصد کے ساتھ تعلق کھو بیٹھے تو مولانا الطاف حسین حالی کو اُمّت کا مرثیہ اس انداز میں پڑھنا پڑا کہ ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دعا ہے
اُمّت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
فریاد ہے اے کشتیٔ اُمّت کے نگہباں!
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

دین سے تعلق کمزور ہونے کے بعد جب مسلمان مختلف فرقوں‘ قوموں اور ذاتوں میں بٹ گئے تو شاعر مشرق علامہ اقبال یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

اور:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں‘ جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!
یوں تو سیّد بھی ہو‘ مرزا بھی ہو‘ افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

ان حالات میں ضرورت ہے کہ تمام علماء اکرام‘ دینی جماعتیں اور مساجد و مدارس سے منسلک حضرات مل بیٹھ کر گہرے غور وخوض کے ساتھ اپنا رخ غلبۂ دین کی جدّوجُہد کی طرف موڑ لیں۔ اپنے پیروکاروں اور عوام الناس کے سامنے نصبِ امامت یا قیامِ خلافت کے فریضے کی اہمیت بیان کریں اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کریں کہ ہمارے موجودہ تمام مسائل کی بنیادی وجہ اسی اہم فریضے سے پہلو تہی ہے۔ مزید برآں‘ یہ بھی واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ اس فریضہ کی ادائیگی خالی خولی نعروں یا صرف جلسے جلوسوں سے نہیں ہوگی بلکہ اس کے لیے ہمیں تعلق باللہ اور تعلق بالقرآن کو مضبوط کرنا ہوگا۔ جب تک رجالِ دین گہری بصیرت کے ساتھ اس مسئلے پر غور و فکر کر کے آگے نہیں بڑھیں گے اُس وقت تک ہمارے درد کا درمان ناممکن ہے۔ ہمارے بعض دینی طبقات کو اس بات کا شعور بھی ہے‘ لیکن وہ یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ قرآن حکیم میں

خلافت کا وعدہ موجود ہے۔ یہ بات اپنی جگہ کسی حد تک درست بھی ہے‘ لیکن سورۃ النور کی آیت ۵۵ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں خلافت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے وہاں اس سے پہلے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ کا یہ وعدہ اُن سے ہے جو ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے ہوں گے۔ لہٰذا ایمانِ حقیقی کے ساتھ موعود خلافت کے لیے جِدّوجُہد کرنا بھی لازم ہے۔ جب تک ہماری جِدّوجہد قیامِ خلافت کے لیے نہیں ہوگی اُس وقت تک اللہ کی مدد بھی صحیح معنوں میں نہیں آئے گی۔

کوئی بھی سلیم الفطرت انسان فتنہ وفساد پسند نہیں کرتا اور اُس کی خواہش ہوتی ہے کہ زمین امن سے معمور ہو جائے‘ ظلم کا خاتمہ ہو جائے‘ عدل قائم ہو جائے‘ تمام انسانوں کو ان کے حقوق ملیں‘ ہم ہر طرح کے تفرقہ وانتشار سے بچ جائیں اور دیگر تمام مسائل حل ہو جائیں۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ اللہ کی عطا کردہ زمین پر اُسی کا عطا کردہ نظامِ زندگی غالب ہو جائے۔

❁❁❁

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن‘ دروسِ قرآن‘ دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری‘ صحیح مسلم‘ موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو روڈیو کیسٹس رسی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

اقبال اور نظامِ تعلیم

پروفیسر نجیب الحق ☆

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ ونجف
فسادِ قلب ونظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

علامہ اقبالؒ جوانی میں اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ اور جرمنی گئے لیکن وہ مغربی تہذیب سے متاثر ہونے کی بجائے اس سے کندن بن کر نکلے اور اسلام اور مسلمانوں کی حالتِ زار اور اس کے علاج کے بارے میں مزید فکرمند ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی حوالوں سے کام کیا۔ ان میں ایک رُو بہ زوالِ اُمّتِ مُسلمہ کی تشکیلِ نو کے بارے میں تعلیم کی اہمیت کا نوجوانان، معمارانِ قوم (اساتذہ) اور سردارانِ قوم کو احساس دلانا بھی ہے۔ وہ تعلیم کو اسلامی تشخص کی ازسرِنو بحالی اور مغرب کی ذہنی غلامی سے نکلنے کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

تاریخ میں نظامِ تعلیم قوموں کے عروج وزوال کی اہم بنیاد رہا ہے۔ جس قوم نے بھی تعلیم کی اہمیت کو صحیح طریقے سے جانا اور اپنے تشخص اور نسل کی تربیت کا انتظام کیا وہ دنیا میں سرخرو ہوئی۔ تعلیم کسی بھی قوم کے بناؤ اور بگاڑ میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اسلام میں تعلیم کی اہمیت

نبی کریم ﷺ کی چند احادیث سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مَیں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص علم کے حصول کی راہ میں چلا اللہ تعالیٰ اُسے جنّت کے راستوں میں سے ایک راستہ پر چلاتے ہیں، اور بے شک ملائکہ اپنے پروں کو علم کے طالب کی خوشنودی کے لیے بچھاتے ہیں، اور

☆ پروفیسر پشاور میڈیکل کالج

عالم کے لیے زمین وآسمان کی تمام اشیاء مغفرت کی دعا کرتی ہیں، حتیٰ کہ مچھلیاں پانی کے پیٹ میں۔ اور بیشک عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چودھویں کے چاند کی فضیلت سارے ستاروں پر۔ اور بلاشبہ علماء انبیاءؑ کے وارث ہیں۔ . . . '' (ابوداوٗد، ترمذی، ابن ماجہ، احمد)

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (ابن ماجه) ''علم کا حصول ہر مسلمان (مرد اور عورت) پر فرض ہے۔''

یہ بات واضح ہے کہ ہر مسلمان تمام دینی علوم حاصل نہیں کر سکتا، لیکن اس حدیث کی روشنی میں علماء نے یہ قرار دیا ہے کہ ایک مسلمان کو درج ذیل چار پہلوؤں سے تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے:

اوّل: عقیدے کی درستگی: اتنی تعلیم جس کے ذریعے ہم اپنے عقیدے کو درست کر لیں۔ مثلاً توحید، رسالت اور آخرت جیسے عقائد کے بارے میں جاننا اور سمجھنا۔ اس سے کسی کو بھی استثناء حاصل نہیں، چاہے وہ دنیاوی طور پر پڑھا لکھا ہو یا نہ ہو۔ ہر عاقل، بالغ مرد اور عورت پر یہ فرض ہے۔

دوم: اتنے علم کا حصول جس سے ہم اپنی عبادات کو درست طریقے سے ادا کر سکیں۔ مثلاً نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوٰۃ ادا کرنا یا حج کرنا۔

سوم: لوگوں سے درپیش ''روزمرّہ کے معاملات'' کی درست طریقے سے ادائیگی کے بارے میں علم، جس میں ان کے حقوق اور ہمارے فرائض شامل ہیں۔ مثلاً پڑوسی کے حقوق، والدین کے حقوق، بچوں کے حقوق وغیرہ۔

چہارم: دین کا اتنا علم جس سے ہم اپنے پیشہ ورانہ فرائض شرعی اصولوں کے مطابق ادا کر سکیں۔ مثلاً ایک ڈاکٹر کو طب کی تعلیم سے متعلقہ دین کا اتنا علم حاصل کرنا ضروری ہے جس سے وہ اپنے پیشے کو دین کے مطابق ادا کر سکے۔

جنگ بدر میں جنگی قیدیوں کو چند افراد کو علم سکھانے کے بدلے آزاد کیا گیا۔ یہ شاید تاریخ میں واحد مثال ہے کہ جنگی قیدیوں کو اس طرح آزاد کیا گیا ہو۔ اس سے اسلام میں علم اور تعلیم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مدینہ میں ایک صحابیؓ آواز بلند کرتے ہیں کہ لوگو تم سب کدھر ہو، وہاں تو (مسجد نبوی میں) نبی ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے! لوگ بھاگ کر جاتے ہیں تو وہاں تعلیم وتعلّم کا حلقہ دیکھتے ہیں، جس کو آپ ﷺ کی میراث کہا گیا تھا۔

موجودہ صورتِ حال

بدقسمتی سے موجودہ نظامِ تعلیم میں پہلی جماعت سے اعلیٰ تعلیم تک‘ پورے کورس اور دورانیے میں شاذ ہی طالب علم کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ اچھا انسان اور مسلمان کیسے بننا ہے! تعلیمی نصاب سے اسلام اور اقدار کو تقریباً ختم ہی کر دیا گیا ہے۔ ہم بحیثیتِ قوم/ اُمّت علم کی اہمیت کو شاید سمجھ نہیں سکے اور آج ہم اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ بقول اقبال:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف!

جبکہ عالمی قوتیں تعلیم کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہودیوں کی کتاب (جس کی تصدیق ونسٹن چرچل اور ہنری فورڈ نے بھی کی ہے) ’’دی پروٹوکولز‘‘ (The Protocols) میں تعلیم کے بارے میں خصوصی طور پر لکھا گیا ہے۔ پروٹوکول نمبر ۲ میں تحریر ہے:

" The intellectuals of Goyim will puff themselves up with their knowledge and without any logical verification will put into effect all the information available from science, which our agentur specialists have continuously pieced together for the purpose of educating their mind in the direction we want. Do not suppose a moment that these statements are empty words."

’’غیر یہودی دانشوران نظریات سے لیس ہو کر بغیر کسی منطقی تصدیق کے ان نظریات کو روبہ عمل لانے کی کوشش کریں گے اور ہمارے ماہر گماشتے اپنی کمال عیاری سے ان کی فکر کا رخ اس طرف موڑ دیں گے جو ہم نے ان کے لیے پہلے سے مقرر کی ہوئی ہے۔ آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ یہ خالی خولی الفاظ ہیں۔‘‘

اس کے بعد درج ذیل پیراگراف بھی دیکھیے جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ قوموں کے افکار میں تبدیلی کو وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کتنا ضروری سمجھتے ہیں:

"It is indispensible for us to take account of the thoughts, character, and tendencies of nations in order to avoid making slips in political and in the direction of administrative affairs"

’’ہمارے لیے دوسری قوموں کے خیالات کا تجزیہ کرنا اور ان کے خصائل و کردار کا مطالعہ کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ سیاسی اور انتظامی امور میں (ہماری) معمولی سی کوتاہی کا احتمال بھی باقی نہ رہے۔‘‘

پاکستان میں سیکولر سکولوں کی امداد اور پاکستان اور افغانستان کو مختلف این جی اوز کے ذریعے مفت درسی کتب کی فراہمی اسی فکر کا تسلسل ہے۔ ان کتب میں جس طرح چن چن کر اسلامی اسباق کو نکالا گیا‘ یہ اسی مقصد کی تکمیل ہے۔ دراصل یہی وہ تبدیلی ہے جس سے بغیر زور و جبر ذہن بدل رہے ہیں۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں — مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

موجودہ نظامِ تعلیم: اقبال کا نظریہ

علّامہ اقبالؒ کو اس امر کا مکمل ادراک تھا کہ تعلیم ہی وہ بنیادی عنصر ہے جو کسی قوم کے بناؤ اور بگاڑ میں سب سے بنیادی کردار ادا کرتا ہے اور جس کے دور رس اثرات قوم کے عمومی مزاج اور سوچ پر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اقبالؒ نے فرمایا:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اِک ڈھیر!

موجودہ نظامِ تعلیم کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ آنے والی نسلوں کی سوچ مغرب کے تہذیبی اور تعلیمی معیارات اور روایات کے مطابق ہو۔ مزید یہ کہ اس تعلیمی نظام کے ذریعے ایسے افراد تیار ہوں جو اپنی شناخت کھو کر اصل آقاؤں کی غیر موجودگی میں ان کے موجودہ آلۂ کاروں سے بھی ’’بہتر‘‘ طریقے سے اس ملک کا نظام ان کی مرضی کے مطابق چلائیں۔ اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے‘ جس کے بارے میں اقبالؒ کہتے ہیں:

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
جو آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پُرکار و سخن ساز ہے‘ نم ناک نہیں ہے!

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

اقبال سمجھتے ہیں کہ اس نظام نے پوری نسل کو غلام بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ساتھ ہی انسانی عقل کو ’’عقل کل‘‘ کا درجہ دے کر وحی اور روحانی تصوّرات کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں خودی اور وجدان ناپید ہیں۔

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

مُردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی؟
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام!

اسی لیے وہ مادہ پرست نظام‘ جس میں دولت کو سب کچھ سمجھ لیا گیا‘ کے مقابلے میں ایسی تربیت پر زور دیتے ہیں جو صرف عقل کی بنیاد پر قائم نہ ہو اور جس میں مادی علوم کے ساتھ ساتھ روحانیت اور وجدانیت بھی پروان چڑھے۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
نشانِ راہ ہے‘ منزل نہیں ہے!

اور

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں!

جب ہر چیز کی کسوٹی مادیت بن جاتی ہے تو اس کا نتیجہ نہ صرف انسانی رشتوں کی کمزوری بلکہ خدا کے وجود ہی سے عملی انکار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

الحاد آج کے نوجوان کا ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ سائنس کے نام پر ذہنوں میں خدا کے وجود اور ضرورت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے گئے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس کے مقابلے میں اسلام زندگی کا جو تصوّر دیتا ہے اسے مکمل طور پر تعلیمی نظام سے نکال دیا گیا ہے۔

آج ہم اس یک طرفہ ’’ذہن سازی‘‘ کا نتیجہ الحاد کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ تعلیم کے ذریعے ذہن کو اس سانچے میں ڈھالنے کے بارے میں اقبال نے فرمایا:

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

اس کے ساتھ ہی ایک اور فتنہ ’’آزادی‘‘ کے نام پر پھیلایا جا رہا ہے جو ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو خصوصی طور پر پراگندہ کر رہا ہے۔ لگتا ہے میڈیا کو تو بس اسی کام پر لگایا گیا ہے کہ وہ اسلام اور پاکستان کے بارے میں منفی سوچ پیدا کرے۔ بے مقصد تعلیم اور ’’آزادیٔ افکار‘‘ جیسے خوشنما نعروں سے ذہنی تبدیلی کا عمل جاری ہے۔ جب معاشرے سے اسلامی شعائر کا خاتمہ ہو جائے تو مسلمان عملاً اسلام اور رفتہ رفتہ ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پھر وہ غیروں کی اقدار اپنانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے‘ بلکہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ اسی کو اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے:

اُس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک!
ہے جس کے تصوّر میں فقط بزمِ شبانہ

لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ آوازۂ تجدید
مشرق میں ہے تقلیدِ فرنگی کا بہانہ

آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

کسی بھی قوم کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ وہ اپنے اہداف کو اپنے مفادات اور نظریات کے مطابق ترتیب دے۔ صرف دوسروں پر تنقید سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اصل بات تو خود تعمیری اور مثبت کام کرنا ہے۔ بغیر کسی پلاننگ کے اور بلا سوچے سمجھے صرف ڈنڈے سے نظام تبدیل نہیں ہوتا‘ نہ ہی ایسی تبدیلی دیرپا ہو سکتی ہے۔ یہ انتہائی قابل افسوس ہے کہ مسلمان قوم کے پڑھے لکھے (میں جان بوجھ کر ’’تعلیم یافتہ‘‘ کا لفظ استعمال نہیں کر رہا) افراد کو یا تو اس صورتِ حال کی خبر ہی نہیں یا پھر وہ اس کی اہمیت کا احساس نہیں رکھتے۔ اقبالؒ نے اس کا اظہار یوں فرمایا:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی اس اہم مسئلے کی طرف توجّہ دلائے اور ان اہم حقیقتوں کی نشان دہی کرے تو لوگ اس کو نہ صرف یہ کہ سنجیدہ نہیں لیتے بلکہ اس کا مذاق اڑانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ مگر جب ان ہی کی اگلی نسل ان کی توقعات پر پورا نہیں اُترتی پھر یہی لوگ نظام اور معاشرے سے گلے شکوے بھی کرتے ہیں کہ ان کے بچے بگڑ رہے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ

اس بگاڑ کا حقیقی ذمہ دار کون ہے!

یہاں اگر مولانا مودودی رحمہ اللہ کے ’’اسلامیہ کالج میں طلبہ سے خطاب‘‘ سے چند اقتباسات کا حوالہ دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا‘ تاکہ اندازہ ہو جائے کہ اُس وقت (جب نظامِ تعلیم میں ایسی گمراہ کن تبدیلیاں کم ہی ہوئی تھیں جو آج ہیں) کے مسلمان مفکرین کی رائے بھی قریب قریب یہی تھی۔ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

> ’’دراصل میں آپ کی اس مادرِ علمی کو اور مخصوص طور پر اسی کو نہیں‘ بلکہ ایسی تمام ماڈرن تعلیم گاہوں کو درس گاہوں کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں‘ اور میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جا رہے ہیں اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں‘ یہ دراصل موت کے صداقت نامے (Death Certificates) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جا رہے ہیں جب کہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا۔‘‘
>
> ’’یقین جانیے یہ بات میں مبالغہ کی راہ سے نہیں کہہ رہا ہوں‘ اخباری زبان میں ’سنسنی‘ پیدا نہیں کرنا چاہتا‘ فی الواقع اس نظام تعلیم کے متعلق میرا نقطہ نظر یہی ہے۔‘‘
>
> ’’ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک لوحِ سادہ کی شکل میں آتا ہے اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوالیہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں‘ خواہ وہ ہماری موت ہی کا فتویٰ کیوں نہ ہو۔‘‘ (تعلیمات: مولانا مودودی رحمہ اللہ)

اگر اُس وقت حالت یہ تھی تو آج کے حالات کا ہم خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ ایسے میں مسلمان مفکرین اور اساتذہ کرام کی ذِمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

استاد کے نام اقبال کا پیغام

حالات کی تبدیلی میں ایک استاد ہی بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے۔ استاد کو نہ صرف اس پوری صورت حال کو اچھی طرح سمجھنا ہے کہ یہ نظامِ تعلیم ہی ہماری بربادی کا اصل سبب ہے‘ بلکہ اس کی اصلاح کے لیے اسے اپنا انفرادی اور اجتماعی کردار بھی ادا کرنا ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کما حقہ پوری کرلے تو دور رس نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) (صحیح مسلم)

کا مفہوم یہ ہے کہ ’’ہر ایک اپنے حلقۂ اثر (circle of influence) کا ذمہ دار اور اس کے بارے میں مسئول ہے‘‘۔ ہم گھر میں اپنے بچوں اور سکول یا کالج میں اپنے طلبہ کی صحیح تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ جو کام ہمارے ذِمّے ہے وہ ہم نے کرنا ہے اور جو کام ہم نہیں کر سکتے اس میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا۔ جو کام ہم کر سکتے ہیں وہ ہمیں ضرور کرنا ہے کیوں کہ ہمیں جواب اور حساب اسی کا دینا ہوگا۔ جو لوگ اس کے لیے اجتماعی جِدّوجُہد کر رہے ہیں‘ ہمیں حتی الوسع اُن کا پشتی بان بھی بننا چاہیے۔

علم اور فن (knowledge and skill) دونوں تعلیم کے اہم ستون ہیں‘ لیکن جب تک تیسرا ستون یعنی رویّہ (attitude) مثبت انداز میں نہیں بدلے گا اور طالب علم کو بحیثیت انسان اور مسلمان اپنے مقام اور ذمہ داری کا صحیح ادراک نہیں ہوگا تب تک معاشرے میں مثبت تبدیلی نہیں آئے گی۔ نظام کے بدلنے کا انتظار کرنے کی بجائے ہمیں اپنے زیرِ اثر حلقہ میں کام کرنا چاہیے۔ اگر ہم شعوری طور پر اس کو ایک قومی اور دینی ذمہ داری تسلیم کر لیں تو پھر کسی بھی ادارے اور ماحول میں اپنا کام کر سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اجر کے امیدوار بھی بن سکتے ہیں۔

رویوں کو بدلنے کے لیے ہم مقدور بھر کوشش کرنے پر ہی مکلف ہیں۔ نتیجے کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھا ہے۔ اُس نے ہم سے اجر کا وعدہ بھی نتیجہ پر نہیں بلکہ اخلاص کے ساتھ کوشش کرنے پر کیا ہے۔ لیکن اگر ہم نے کوشش ہی نہیں کی تو اس کے لیے ہمیں ضرور جواب دینا ہوگا۔ مرد‘ عورت‘ جوان اور بزرگ سب لوگ اپنی اپنی جگہ جواب دہ ٹھہریں گے۔

استاد کا تو بنیادی کام ہی شاگردوں کی روح کے علاج کی فکر کرنا ہے‘ یعنی اُن کے اخلاق و کردار پر توجہ دینا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر　　جس کی صنعت ہے روحِ انسانی

لیکن اگر استاد کو اس ذمہ داری کا احساس ہی نہ ہو تو وہ یہ کام کیسے کر سکتا ہے؟ اس لیے اہم ترین بات ہی یہ ہے کہ استاد اپنے کام کو سمجھ جائے اور اُسے اپنی ذمہ داری کا احساس اور ادراک ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے آپ کو ’’معلم‘‘ کہا ہے۔ فرمایا: ((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) (ابن ماجه) ’’مجھے تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہے‘‘۔ اس سے بڑھ کر ایک استاد کے لیے فخر کی بات کیا ہو سکتی ہے! تعلیمی نظام میں اُستاد ہی محور کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اس نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر استاد کا اپنا ذہن

صاف‘ تصوّرات واضح اور تربیت ٹھیک ہو تو وہ ہر نظام میں اہم‘ مثبت اور کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے‘ لیکن اگر اُس کا ذہن پراگندہ‘ تصوّرات مبہم اور مقصد غیر واضح ہو تو اچھے سے اچھا نصاب اور تعلیمی نظام بھی سود مند ثابت نہیں ہوگا۔

استاد کی حالت یہ نہ ہو کہ نام تو مسلمان کا ہو اور مقصد کسی اور کا پورا کر رہا ہو۔ اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے وہ کسی بھی ادارے سے ٹریننگ حاصل کر سکتا ہے‘ بس بقول اکبر الٰہ آبادی ایک بات ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہے کہ:

بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد　　اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو!

یہ بہت بدقسمتی ہے کہ آج اساتذہ کی اکثریت ایسی نہیں ہے۔ بیرونی ممالک میں رہ کر یا ملک کے اندر غیروں کے قائم کردہ اداروں میں ’’ٹریننگ‘‘ کے نام پر جس رنگ میں وہ رنگ جاتے ہیں‘ اپنے شاگردوں کو بھی وہ وہی رنگ منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے ہی اساتذہ کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا:

تیرا وجود سراپا تجلّیٔ افرنگ　　کہ تُو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی　　فقط نیام ہے تُو‘ زرنگار و بے شمشیر!

آج ہمارا المیہ ہی ’’استاذ‘‘ ہے۔ اسی لیے اقبال گلہ بھی استاد ہی سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا!

فکرِ معاش ایک ضرورت ہے۔ لیکن کیا معاش ہی سب کچھ ہے؟ اور کیا اسی گرداب میں پھنس کر ہم اور بہت کچھ تو نہیں گنوا رہے اور اپنے اصل کام اور مقصد سے غافل تو نہیں ہو گئے؟ بدقسمتی سے آج ہم بس فکرِ معاش میں ہی الجھ کر رہ گئے ہیں۔ اسی حالت کو اقبال نے یوں بیان فرمایا:

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری‘ دے کے تجھے فکرِ معاش!
دل کی آزادی شہنشاہی‘ شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے‘ دل یا شکم؟

ہمارا ایمان ہے کہ جو رزق اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے وہ ہم سے کوئی نہیں چھین

سکتا‘ البتہ ہم پر اس کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق جِدّ و جُہد کرنا فرض ہے۔ استاد کو وقتی فوائد‘ گریڈ‘ چاپلوسی‘ کام چوری اور اسی طرح کی دوسری زنجیروں کو کاٹنا ہوگا کہ جب تک اس کے پاؤں میں یہ زنجیریں پڑی رہیں گی تب تک وہ ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کی طرف دلجمعی سے آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ رزقِ حلال کا حصول اگر ہم ضرورت کی حد تک رکھیں تو یہ نہ صرف جائز بلکہ احسن بھی ہے۔

تعلیم اور تربیت دونوں استاد کی ذمہ داری ہے۔ جب یہ دونوں موجود ہوں تو نتیجہ علمِ نافع کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی ہی تعلیم کو اقبال اُمّت کی زبوں حالی کا علاج سمجھتے ہیں:

مرشد کی یہ تعلیم تھی اے مسلمِ شوریدہ سر　　لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامانِ سفر
بدلی زمانے کی ہوا‘ ایسا تغیّر آ گیا　　تھے جو گراں قیمت کبھی‘ اب ہیں متاعِ کس مخر
وہ شعلۂ روشن ترا ظلمت گریزاں جس سے تھی　　گھٹ کر ہوا مثلِ شرر تارے سے بھی کم نور تر!
شیدائی غائب نہ رہ‘ دیوانۂ موجود ہو　　غالب ہے اب اقوام پر معبودِ حاضر کا اثر
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملّت کی دوا　　ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیم مثلِ نیشتر

ایک مسلمان استاد جہاں کہیں بھی ہو‘ اُسے تعلیم و تربیت کا فرض نبھانا ہے۔ اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ دل و دماغ آزاد ہوں گے تو‘ اِن شاء اللہ‘ پھر حالت یہ ہوگی کہ:

دیکھے تُو زمانے کو اگر اپنی نظر سے　　اَفلاک منور ہوں ترے نورِ نظر سے!

اور اس لیے اقبال استاد سے دردمندانہ درخواست کرتے ہیں کہ

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت　　دے ان کو سبق خود شکنی‘ خود نگری کا
تُو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے　　مغرب نے سکھایا انہیں فن شیشہ گری کا!
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی　　دارو کوئی سوچ ان کی پریشان نظری کا!

استاد کو نہ صرف یہ کہ اس عیارانہ اور کافرانہ حکمتِ عملی کے نتیجے میں نظامِ تعلیم میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا مکمل ادراک کرنا ہے بلکہ اس کی اصلاح کے لیے اس کارِ خیر میں اپنا حصّہ بھی ڈالنا ہے۔ انفرادی کوششیں مل کر ہی اجتماعی اصلاح کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ہمیں غیروں کے رنگ میں رنگ کر اس نظام کو تقویت نہیں دینی کہ یہ تو ’’کاروبارِ لات و منات‘‘ ہی کو زندہ کرنے میں آلۂ کار بننے کے مترادف ہوگا۔ استاد کو نہ صرف اپنی ذاتی تربیت اور صلاحیت کی فکر کرنی ہے بلکہ بہت سوچ کر یہ فیصلہ بھی کرنا ہوگا کہ وہ جو تعلیم اپنے شاگردوں کو دے رہا ہے اس کا نتیجہ کیا نکل رہا ہے! کہیں

وہ خود اقبالؒ کے اس شعر کا مصداق تو نہیں کہ:

حریم تیرا' خودی غیر کی! معاذ اللہ
دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات!

اپنی اقدار' تہذیب اور دین کو دوبارہ زندہ کرنے کی جِدّوجُہد ہر فرد کی انفرادی اور بحیثیت مسلمان قوم ہماری اجتماعی ذِمہ داری ہے' مگر اس کے لیے انتھک محنت اور منظم جِدّوجُہد اوّلین شرط ہے۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ یہ آسان کام نہیں ہے' کیونکہ یہ غیروں کی صدیوں کی محنت اور ہماری صدیوں کی غفلت اور ذہنی غلامی کی پیدا کردہ صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ فرماتے ہیں؛

بات الجھی ہے تو سلجھے گی بڑی دیر کے بعد اہلِ دانش نے بہت سوچ کے الجھائی ہے

یہ بگاڑ ایسے ہی پیدا نہیں ہوا۔ The Protocols کے دانشور' لارڈ میکالے کی قماش کے دانشور' نائن الیون کی سفارشات کے دانشور اور کئی دوسرے اہلِ دانش نے مل کر مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کو خراب اور برباد کرنے میں اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے اور ڈال رہے ہیں۔ اگر استاد مسلمان قوم کی اس بیماری کی صحیح تشخیص کرلے تو' اِن شاء اللہ' اس کا تیر بہدف علاج بھی مشکل نہ ہوگا۔ استاد کا کام یہ ہے کہ احسن طریقے اور حکمت سے محنت کرے۔ اس کے نتیجے میں کون بدلتا ہے اور کس کو اللہ یہ توفیق نہیں دیتا' اس کی ذمہ داری اللہ نے اس پر نہیں ڈالی' بلکہ تبدیلی کی ذمہ داری تو اللہ کے رسول ﷺ پر بھی نہیں ڈالی گئی:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿٤١﴾﴾ (الزُّمر)

''(اے نبی ﷺ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کر دی ہے۔ اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اُس کے بھٹکنے کا وبال اُسی پر ہوگا' تم اُن کے ذمہ دار نہیں ہو۔''

جب رسول اللہ ﷺ کی بھی یہ ذمہ داری نہیں لگائی گئی کہ لازماً تبدیلی لائیں تو پھر ہمیں بھی نتیجے کا انتظار کیے بغیر اپنا کام جاری رکھنا ہے۔ اللہ ربّ العزت ہمیں اجر اسی کا اجر دے گا کہ ہم یکسوئی اور خلوصِ دل سے تعلیم کے ذریعے تبدیلی کی کوشش کریں۔

ہمیں بحیثیت مسلمان استاد یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ معلمی پیشہ نہیں بلکہ ایک

مشن ہے۔ یہ نبی کریم ﷺ کی میراث ہے۔ معلّم کا کام صرف معلومات منتقل کرنا نہیں بلکہ طلبہ کی تربیت اور تزکیہ بھی اس کی ذمہ داری میں شامل ہیں۔ اگر ایک طالب علم کو اسلام کے مطابق ''مقصدِ زندگی'' کی تعلیم نہ دی جائے اور وہ اپنی تعلیم کو صرف دنیاوی آسائشوں اور حصولِ دولت کا ذریعہ سمجھنے لگے تو اُس سے معاشرے میں ایک تعمیری اور مثبت کردار کی توقع عبث ہوگی۔ سنار اگر ٹکسال میں لوہا ڈالے اور اُمید یہ رکھے کہ اس سے سونے کے سکّے نکلیں گے تو ایسے سنار کو لوگ پاگل ہی کہیں گے۔ استاد کو بھی سوچنا ہوگا کہ وہ اپنے شاگرد کے ذہن میں کیا ڈال رہا ہے!

وسائل کی فراہمی کسی بھی کام کے لیے ضروری ہے' لیکن تاریخ گواہ ہے کہ صرف وسائل سے کبھی تبدیلی نہیں آئی۔

سبب کچھ اور ہے تُو جس کو خود سمجھتا ہے زوال بندۂ مؤمن کا بے زری سے نہیں!

پاکستان کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں وسائل کی کمی نہیں بلکہ ایک ایسی مخلص' قابل اور صالح قیادت اور انتظامیہ (بیوروکریسی) درکار ہے جو موجودہ وسائل کا صحیح استعمال کرے اور اس ملک کے عوام کی تقدیر بدل دے۔ ایسے افراد اسی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہو سکتے ہیں جس کا مطمحِ نظر ایسے باکردار اور باصلاحیت افراد تیار کرنا ہو۔

اساتذہ کی اپنی تربیت موجودہ تعلیمی نظام کو قومی اور اسلامی خطوط پر استوار کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ ان کی مشترکہ جِدّوجُہد سے قوم کے نونہال پوری اُمّتِ مُسلمہ کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ علم کے ذریعے تبدیلی کی جِدّوجُہد ہر مسلمان استاد کا قومی فریضہ اور دینی ذِمہ داری ہے۔ اگر اسے زندگی میں یہ تبدیلی دیکھنا نصیب ہوگئی تو فبہا اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو پھر بھی اسے اللہ کے حضور سرخرو ہونے کی قوی امید رکھنی چاہیے۔

یہ بازی عشق کی بازی ہے' جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا' ہارے بھی تو بازی مات نہیں!

✿✿✿

پیغام اور کردار کی طاقت

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

دنیا میں بے شمار لوگ بڑے اونچے قد اور بے پناہ شہرت کے ساتھ کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں حکماء بھی ہیں اور فلاسفر بھی‘ سلاطین بھی ہیں اور فاتحین بھی‘ شعراء بھی ہیں اور علماء بھی‘ اہلِ زر بھی ہیں اور اصحابِ ہنر بھی‘ لیکن حکماء باریک اور دقیق نکتے تو پیدا کر سکے‘ زندگی کے اطوار نہ بدل سکے۔ فلسفی فنّی بحثوں میں پڑے رہے‘ جبکہ انسان پستی کے گڑھوں میں گرے رہے۔ سلاطین کی عظمت کے ڈنکے تو بجے‘ مگر انسانی عظمت کو بڑے چرکے لگے۔ فاتحین نے ملک تو فتح کیے‘ لیکن دل مفتوح نہ کر سکے۔ شعراء کی خیال آفرینی اپنی جگہ‘ لیکن اصل سوال انسان کی باز آفرینی کا ہے۔ علماء فقہی و کلامی مسائل تو حل کرنے میں کامیاب رہے‘ مگر خالص انسانی مسائل تشنۂ تکمیل رہے۔ اہلِ زر خزانوں کے مالک بنے‘ انسانوں کے محافظ نہ بن سکے اور اصحابِ ہنر کی ساری فن کاری اُن کی اپنی ذات کے لیے تھی‘ کائنات ان کی خوبیوں سے استفادہ نہ کر سکی۔ انسانوں کی جماعت میں صرف انبیاء کرام علیہم السلام وہ مقدس لوگ ہیں‘ جن کے پیغام میں وسعت اور کردار میں طاقت تھی‘ اور یہی عالمِ انسانی کی اصل ضرورت ہے۔ جو فرد یا طبقہ کی ضرورت پوری نہیں کرتا‘ اُس کا سارا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔

آج دنیا میں جو اُجالا ہے‘ وہ کسی حکیم و فلسفی‘ سلطان و فاتح‘ شاعر و متکلّم اور صاحبِ سرمایہ و فن کے باعث نہیں‘ بلکہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات اور سیرت کا فیض ہے۔ یہی لوگ تھے جن کی سوچ آفاقی اور عمل کائناتی تھا۔ یہ اپنی ذات کے لیے نہیں‘ کائنات کے لیے سوچتے تھے۔ صرف بات پر اکتفا نہیں کرتے تھے‘ جو کہتے تھے اُس پر پہلے خود عمل کرتے تھے۔ اس لیے ان کے پیغام کو وسعت بھی ملی اور ان کے کردار کو عظمت اور قوت بھی نصیب ہوئی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی اکثریت غریب خاندانوں‘ غریب لوگوں اور غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والی تھی‘ مگر ان کے حلقۂ تربیت و عقیدت میں بڑے بڑے سلاطین اور فاتحین داخل ہوتے۔ ان کے

حلقۂ ارادت میں نامی گرامی حکماء اور ادباء آئے اور ان کے حلقۂ اثر میں شہر و ملک تو کیا‘ پورے کے پورے براعظم شامل ہوئے۔ یہ پھیلاؤ‘ یہ وسعت اور یہ اشاعت تلوار کے زور پر نہیں‘ بلکہ تعلیم و کردار اور اخلاق و سیرت کے زور پر ہوئی۔ اور یہی ان کا سب سے بڑا معجزہ اور کارنامہ ہے‘ جس نے انہیں لوحِ کائنات اور جریدۂ عالم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ثبت کر دیا ہے۔ اور انسانی تاریخ کا کوئی دَور اُن کو نظر انداز کر کے اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتا۔

انبیاء کرام علیہم السلام کا پیغام بھی خوب تھا اور ان کا کردار بھی قابلِ رشک‘ یہ دونوں چیزیں مل کر بنائے انقلاب ثابت ہوئیں۔ پیغام اچھا ہو‘ کردار نہ ہو‘ تو کتابوں میں گم ہو جاتا ہے اور اگر کردار تو بہتر ہو‘ مگر پیغام سطحی ہو‘ تو کبھی عالم گیری شان پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح سورج اور اس کی کرن اور پھول اور اس کی خوشبو کا آپس میں فطری و لازمی ربط ہے‘ اسی طرح پیغام اور کردار دونوں جڑواں بھائی ہیں‘ انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔

معروف عالمِ دین اور صاحبِ اسلوب نثر نگار مولانا سیّد سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> ’’میں ۱۹۲۴ء میں مصر و حجاز کے سفر سے واپس آ رہا تھا‘ بحری جہاز کا سفر تھا اور اتفاق سے مشہور شاعر اور دانش ور ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور بھی امریکہ کے سفر سے واپسی پر اس جہاز میں تھے۔ ان سے سوال کیا گیا کہ برہمو سماج تحریک کی ناکامی کا کیا سبب تھا؟ حالانکہ وہ بڑی پُرامن‘ منصفانہ اور انسانی محبّت کی تحریک تھی‘ وہ ہر مذہب کے بنیادی اصول و کلیات کو سچ ماننے والی اور ہر مذہب کے پیروکاروں میں اخوت کو اجاگر کرنے والی تحریک تھی۔ اس کا لائحہ عمل بھی سائنٹیفک اور انداز بھی پُرکشش تھا‘ مگر اس کے باوجود وہ آگے نہ چل سکی۔ تو فلسفی شاعر ٹیگور نے بڑا خوبصورت اور جامع جواب دیا۔ کہنے لگے: اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اصول بڑے اچھے اور پیغام بڑا حسین تھا‘ مگر اس کی پشت پر کوئی عملی شخصیت موجود نہ تھی‘‘---

بلاشبہ پیغام کی وسعت اور کامیابی کے لیے اس کے پیچھے ایک باعمل داعی کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس باب میں اسلام کو یہ اعزاز اور فوقیت حاصل ہے کہ اس کا پیغام بھی خوب ہے اور اس کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوب تر ہے۔ ان دونوں کا ملاپ کسی تحریک کی کامیابی کے لیے ضامن بنتا ہے۔ اس راز کو انبیاء کرام علیہم السلام نے خوب سمجھا اور پھر دنیا کو ان کا پیغام سمجھنے میں کوئی

وقت پیش نہ آئی۔ اس کی ایک روشن اور واضح مثال ہرقل روم کے دربار میں ہونے والا ایک مکالمہ ہے‘ جو اس دعوے کی بڑی طاقت ور دلیل ہے۔

۶ ہجری میں صلح حدیبیہ سے فارغ ہونے کے بعد حضور نبی کریم ﷺ نے پڑوسی ممالک کے فرماں رواؤں کو دعوتی و تبلیغی خطوط روانہ کیے‘ ایک خط حضرت دحیہ قلبی ؓ کے ذریعے قیصر روم ہرقل کے نام بھیجا۔ وہ ان دنوں بیت المقدس میں مقیم تھا۔ اس نے خط پا کر اپنے افسروں کو کہا: اگر حجاز کے تاجر یہاں آئے ہوئے ہیں‘ تو انہیں میرے پاس حاضر کیا جائے‘ تاکہ مَیں صورت حال کا جائزہ اور اس پیغام کے بارے میں معلومات حاصل کرسکوں۔ اتفاق سے اسی زمانے میں قریشی سردار ابوسفیان (جو اُس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے) ایک تجارتی قافلے کے ہمراہ شام گئے ہوئے تھے اور غزہ میں مقیم تھے۔ رومی افسر انہیں لے کر قیصر کے دربار میں پیش ہوا۔ قیصر نے اہل قافلہ سے پوچھا: تم میں کون ہے جو مدعیٔ نبوت کا قریبی رشتہ دار اور واقف کار ہو؟ ابوسفیان آگے بڑھ کر بولے کہ مَیں ہوں‘ ان کے حالات سے پوری طرح آگاہ اور رشتہ دار۔ فرمایئے! کیا حکم ہے؟ اور کیا معاملہ درپیش ہے؟

ہرقل نے درباریوں سے کہا کہ باقی اہل قافلہ کو پیچھے کر دو اور ابوسفیان کو میرے قریب لاؤ‘ تاکہ مَیں اس سے کچھ سوال و جواب کرسکوں اور محمد مصطفی ﷺ کی طرف سے بھیجے گئے خط اور قبولِ اسلام کی دعوت کے بارے میں وضاحتیں طلب کرسکوں۔ پھر اُس نے ابوسفیان کے ساتھیوں سے کہا کہ مَیں تمہارے سردار سے کچھ باتیں پوچھوں گا‘ اگر وہ صحیح جواب نہ دے تو تم ٹوک دینا اور اس کی تصحیح کر دینا‘ تاکہ مجھے کوئی غلط فہمی اور خلجان لاحق نہ ہو۔

ابوسفیان کہا کرتے تھے کہ اگر مَیں اس بات سے خوفزدہ نہ ہوتا کہ میرے ساتھی مکّہ میں جا کر میری دروغ گوئی کا چرچا کریں گے اور مجھے رسوا کریں گے‘ تو مَیں ہرقل کے ساتھ سوال و جواب میں ضرور ہیر پھیر کرتا‘ تاکہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے بارے میں وہ تذبذب کا شکار ہو جاتا۔ تاریخ میں محفوظ رہنے اور جگہ پانے والا یہ مکالمہ کچھ اس طرح ہے:

ہرقل: یہ شخص جو نبوت کا مدعی ہے‘ وہ نسب میں کیسا ہے؟

ابوسفیان: نہایت عالی حسب اور شریف النسب ہے۔

ہرقل: اس سے پہلے بھی کسی نے اس کے خاندان میں نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں‘ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔

ہرقل: کیا اس کے باپ دادا میں سے کوئی بادشاہ تھا؟

ابوسفیان: نہیں!

ہرقل: اس کے دین کو جن لوگوں نے قبول کیا ہے وہ اشرافیہ اور معززین ہیں یا کمزور اور بے حیثیت لوگ اور محروم و مظلوم؟

ابوسفیان: زیادہ تر غلام‘ بے وقعت‘ کمزور‘ غریب اور گرے پڑے لوگ ہیں۔

ہرقل: اس کے ماننے والوں میں کمی ہو رہی ہے یا لوگ برابر بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: روز بروز بڑھ رہے ہیں۔

ہرقل: کیا کوئی شخص قبولِ اسلام کے بعد اس سے منحرف بھی ہوا ہے یا اپنی جگہ جما ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں‘ کوئی منحرف نہیں ہوا اور پوری استقامت سے وہ اپنے عقیدے پر قائم ہے۔

ہرقل: کیا دعوائے نبوت سے پہلے لوگوں کو اس سے کسی جھوٹ کا تجربہ ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں‘ وہ صادق اور راست باز شخص ہے۔

ہرقل: اس نے کبھی کسی سے کوئی بدعہدی کی ہے؟

ابوسفیان: نہیں‘ اب تک کوئی ایسی شہادت نہیں ملی کہ وہ اپنے وعدے سے پھرا ہو۔

ہرقل: اس سے کبھی تمہاری جنگ ہوئی؟

ابوسفیان: ہاں!

ہرقل: کیا نتیجہ نکلا؟

ابوسفیان: کبھی ہم ہارے اور کبھی وہ۔

ہرقل: اچھا یہ بتاؤ‘ اس کا پیغام کیا ہے؟ اور وہ کیا مطالبہ کرتا ہے؟

ابوسفیان: وہ کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو‘ کسی کو اُس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ‘ اپنے آباء واَجداد کا مذہب چھوڑ دو‘ نماز پڑھو‘ سچ بولو‘ بے حیائی اور زنا سے بچو‘ پرہیزگاری اختیار کرو‘ خیرات کرو‘ عزیز و اقارب سے نیکی کرو‘ فیاضی‘ رحم دلی اور صلہ رحمی والا سلوک کرو۔

اس مکالمے کے بعد ہرقل بولا: اے سردارِ قریش! جو کچھ تم نے کہا ہے‘ اگر یہی ہے تو مدعیٔ نبوت بلاشبہ سچا نبی ہے۔ مجھے یہ خیال ضرور تھا اور میں نے سن بھی رکھا تھا کہ ایک پیغمبر آنے

والا ہے‘ لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ عرب میں ظاہر ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ میرے پاؤں کے نیچے کی زمین پر قبضہ کر لے گا‘ مَیں اُس کی صداقت کا اعتراف کرتا ہوں‘ میرے بس میں ہوتا تو مَیں اس کے پاؤں دھوتا۔

ہرقل کا یہ طرزِ عمل دیکھ کر ابوسفیان کے ہوش گم ہو گئے اور اپنے رفقاء سے آ کر کہا:

’’محمد کا معاملہ تو اب اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ رومی گوروں کا بادشاہ بھی اس سے دبنے اور ڈرنے لگا ہے‘‘---

یہ ایمان افروز‘ وجد آفرین‘ تاریخ ساز اور انتہائی پُرفخر مکالمہ پیغام و کردار کی طاقت کو خوب واضح کرتا نظر آتا ہے اور عربی کا وہ مشہور مقولہ غالباً اس موقع کے لیے موزوں کیا گیا ہے: اَلْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ ـــ ’’فضل و کمال تو دراصل وہ ہوتا ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں‘‘ــــ جس دور کا یہ مکالمہ ہے‘ ابوسفیان مخالفین اسلام کا سرخیل اوّل تھا اور ہرقل غیر جانب دار‘ مگر ابوسفیان کو جرأت نہ ہو سکی کہ وہ خلافِ واقعہ کوئی بات کہہ سکے یا اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام اور کردار کو جھٹلا سکے۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب کی مانند اسلام کی تعلیم خود اس کی صداقت کی روشن دلیل ہے۔ اور حضور نبی اکرم ﷺ کا کردار آپؐ کا زندہ معجزہ اور ناقابلِ تردید حوالہ اور کارنامہ ہے۔

مسلمانوں نے بلاشبہ جنگیں بھی لڑیں‘ مختلف علاقوں کو اپنی قلمرو میں بھی شامل کیا‘ اور جہاد کے عمل میں بھی شریک رہے‘ مگر اسلام تلوار سے نہیں‘ اپنے پیغام اور اپنے داعی کے کردار سے پھیلا۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ مسلمان ہزیمت سے دوچار ہوئے‘ علاقوں سے نکالے گئے‘ ان کے ملک چھینے گئے اور ان کی نسل کشی ہوئی‘ مگر اسلام کی اشاعت اپنی فطری رفتار سے جاری رہی‘ اس کا حکومتی و حربی غلبے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ افریقہ کے ریگ زار ہوں یا مشرقِ بعید کے جزائر‘ ایشیا کے میدان ہوں یا یورپ کے مرغزار‘ ہر جگہ اسلام کی خوشبو پھیلی اور اس کے پیچھے پیغام کی آفاقیت اور کردار کی طاقت کارفرما تھی۔

❁❁❁

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ

احمد علی محمودی

حالاتِ زندگی

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام زمانۂ جاہلیت میں عبدالکعبہ تھا۔ آپؓ اُن پانچ خوش نصیبوں میں سے تھے جنھوں نے ابتدا ہی میں سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کی دعوت پر اسلام قبول کیا۔ آپؓ کے علاوہ اُس وقت تک سیّدنا عثمان بن عفان‘ زبیر بن العوام‘ طلحہ بن عبیداللہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم مسلمان ہوئے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے آپؓ کا نام تبدیل فرما کر عبدالرحمٰن رکھا۔ آپؓ کے والد عوف کا تعلق بنوزہرہ سے تھا‘ آپؓ کی والدہ کا نام شفاء تھا‘ ان کا تعلق بھی بنوزہرہ سے تھا۔ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے والدین آپس میں چچازاد تھے۔ آپؓ ہجرت سے ۴۴ سال پہلے پیدا ہوئے۔ قبولِ اسلام کے وقت آپؓ کی عمر کم وبیش تیس سال تھی۔ آپؓ عمر میں اللہ کے رسول ﷺ سے دس سال چھوٹے تھے۔ قریشی تھے۔ آپ کا حسب نسب چھٹی پشت پر جا کر اللہ کے رسول ﷺ سے مل جاتا ہے۔ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور شروع ہی سے پاکیزہ نفس انسان تھے۔ اپنی سلامت روی کی بدولت زمانۂ جاہلیت ہی میں شراب چھوڑ دی تھی۔ آپؓ کے والد عوف تاجر تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں وہ تجارت کے لیے یمن گئے ہوئے تھے کہ راستے میں ان کے دشمنوں نے انہیں قتل کر دیا۔ ان کی والدہ شفاء بنت عوف اسلام کی نعمت سے مالا مال ہوئیں اور ہجرت بھی کی۔ اللہ کے رسول ﷺ کی والدہ ماجدہ کا تعلق بھی بنوزہرہ سے تھا۔ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی اپنے والد کی طرح تاجر پیشہ تھے۔

ہجرتِ حبشہ و مدینہ طیبہ

سیرت نگاروں کے مطابق اسلام قبول کرنے والوں میں آپؓ کا تیرھواں نمبر تھا۔ اسلام

لانے کے سبب آپؓ کو بھی بہت ستایا گیا‘ اس لیے آپؓ بھی حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے پہلے قافلے میں شامل ہو گئے۔ لیکن بعد میں واپس مکّہ آ گئے اور ۱۳ نبوی میں مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی۔ مدینہ آئے تو اپنا گھر بار اور تجارت ہر چیز حتیٰ کہ بیوی بچے بھی مکّہ میں چھوڑ آئے۔ یہاں پہنچے تو بالکل قلّاش تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے اور سیّدنا سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے مابین مواخات کا رشتہ قائم کیا۔ ان کے اسلامی بھائی نے بے مثال ایثار سے کام لینا چاہا‘ لیکن سیّدنا عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کی بے نیاز اور غیور طبیعت نے ان کی پیشکش قبول نہ کی۔ سیّدنا سعدؓ کا کہنا تھا کہ میں مدینہ طیبہ کے امیر ترین لوگوں میں سے ہوں‘ میرے کئی باغات اور زرعی زمینیں ہیں‘ دو بیویاں ہیں۔ میں اپنا آدھا مال آپؓ کے حوالے کرتا ہوں۔ دونوں بیویاں دیکھ لیں جو آپؓ کو پسند آئے‘ مَیں اُسے طلاق دے دیتا ہوں‘ جب عدّت گزر جائے تو آپؓ اس سے نکاح کر کے اپنا گھر بسا لیں۔ مگر اس قریشی نوجوان نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جواب میں کہا: ’’اللہ آپ کے مال میں برکت عطا فرمائے۔ مجھے آپ بازار کا راستہ بتا دیں جہاں خرید وفروخت ہوتی ہو۔‘‘ سیّدنا سعدؓ نے کہا کہ بنوقینقاع کا بازار بڑا مشہور ہے۔ یہ بازار ’’البقیع‘‘ کے بائیں جانب کچھ فاصلے پر تھا۔ آپؓ صبح سویرے بازار گئے۔ شام کو واپس آئے تو آپؓ کے پاس کچھ فاضل پنیر اور گھی تھا۔ اس کے بعد آپؓ روزانہ بازار جاتے اور سامان خرید کر فروخت کرتے۔

شادی

ایک دن آپ رضی اللہ عنہ کے لباس پر حجلہ عروسی کی بشاشت جھلک رہی تھی‘ یعنی زعفرانی رنگ کا اثر تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا تو پوچھا: ’’عبدالرحمٰن! کیا ماجرا ہے؟‘‘ عرض کیا: مَیں نے ایک انصاری عورت سے شادی کر لی ہے۔ ارشاد ہوا: ’’اس کو مہر کیا دیا؟‘‘ عرض کیا: کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا۔ فرمایا: ’’ولیمہ ضرور کرو‘ چاہے ایک بکری ہی ہو۔‘‘

کاروبار میں ترقی کے تین رہنما اصول

سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی تجارت دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ جب آپؓ سے کاروبار کی ترقی کا راز پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا: مَیں تین کام کرتا ہوں:

(۱) مال اُدھار نہیں خریدتا۔

(۲) مال اُدھار نہیں بیچتا۔

(۳) کل کی اُمید پر مال نہیں روکتا کہ مہنگا ہوگا تو بیچوں گا۔ اگر آج مجھے ایک دینار نفع مل رہا ہے اور یہ پختہ اُمید ہو کہ کل بیچوں گا تو مجھے دس دینار نفع ملے گا‘ تو مَیں اسے آج ہی بیچوں گا‘ کل کا انتظار نہیں کروں گا۔

رسول اللہ ﷺ کی دعا

ایک مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں چار ہزار درہم لے کر حاضر ہوئے۔ آپؓ کے پاس اُس روز آٹھ ہزار درہم تھے۔ فرماتے ہیں: مَیں نے چار ہزار درہم اپنے گھر والوں کے لیے چھوڑے اور چار ہزار اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر دعا فرمائی: ((بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْمَا أَمْسَکْتَ وَفِیْمَا أَعْطَیْتَ)) ’’اللہ تمہارے اُس مال میں بھی برکت دے جو تم نے گھر میں رکھا اور اس میں بھی جو تم نے اللہ کی راہ میں دیا‘‘۔ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی دعا کی برکت تھی کہ وہ صحابہ کرامؓ میں سے امیر ترین شخص بن گئے۔ جیسے جیسے ان کے مال و دولت میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے وہ اللہ کی راہ میں زیادہ خرچ کرتے چلے گئے۔ ان کی سخاوت کے بارے میں سیرت نگاروں نے بہت سے واقعات بیان کیے ہیں۔ ایک موقع پر جہاد کے لیے انہوں نے پانچ سو گھوڑے اور پندرہ سو اونٹ پیش کیے۔ دو مرتبہ چالیس چالیس ہزار دینار اللہ کی راہ میں دیے۔

آپؓ نے متعدد شادیاں کیں‘ بیس بیٹے اور آٹھ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ وہ نہ صرف اللہ کے رسول ﷺ کے زمانۂ اقدس میں نمایاں صحابہؓ میں سے تھے بلکہ سیّدنا ابوبکر صدِیق اور سیّدنا عمر فاروق ؓ کے دور میں بھی ان کے مشیر خاص تھے۔ وہ ان حضرات کی موجودگی میں فتویٰ بھی دیا کرتے تھے۔

متقی اور پرہیزگار

بیت المقدس کی فتح کے موقع پر مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان جو معاہدہ ہوا‘ اس کے گواہوں میں سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف ؓ بھی شامل تھے۔ سیّدنا عمر فاروق ؓ شام کے دورے پر تھے۔ اسی دوران آپؓ کو اطلاع ملی کہ وہاں طاعون کی وبا پھیل گئی ہے۔ آپؓ نے پلٹنا

چاہا تو سیّدنا ابوعبیدہ بن الجراح ؓ نے اس کی بھرپور مخالفت کی اور کہا کہ ’’آپ شام ضرور جائیں‘ کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے فرار ہونا چاہتے ہیں؟‘‘ اس موقع پر سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف ؓ بھی آ گئے۔ آپؓ نے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیثِ مبارکہ بیان کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جب تم کسی شہر میں وبا کی خبر سنو تو وہاں نہ جاؤ‘ اور اگر تم وہاں (پہلے ہی) موجود ہو تو وہاں سے مت نکلو‘‘۔ سیّدنا سالم بن عبداللہ بن عمر ؓ فرماتے ہیں: شام سے واپس پلٹنے کی وجہ صرف سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت کردہ حدیث تھی۔

اگر ان کے حالاتِ زندگی کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ واقعی نہایت زیرک اور صائب الرائے شخصیت تھے۔ ان کو امیر المؤمنین عمر فاروق ؓ کا بے حد قرب اور اعتماد حاصل تھا۔ بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سیّدنا عمر فاروق ؓ اپنے بعد خلافت کی ذمہ داریاں انہی کو سونپنا چاہتے تھے‘ مگر وہ اس پر قطعاً راضی نہ ہوئے۔ بلاشبہ وہ نہایت متقی اور پرہیزگار انسان تھے۔ انتہائی مالدار ہونے کے باوجود وہ بڑے منکسر المزاج تھے۔ ایک مرتبہ روزے سے تھے‘ افطاری کے وقت ان کے سامنے کھانا رکھا گیا تو فرمایا: حضرت مصعب بن عمیر ؓ کو اُحد کے میدان میں شہید کر دیا گیا‘ وہ مجھ سے بہتر تھے۔ ان کو ایک ایسی چادر میں کفن پہنایا گیا کہ اگر اسے سر پر ڈالا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے تھے اور اگر پاؤں پر ڈالتے تو سر ننگا ہو جاتا تھا۔ مَیں نے ان کو اس حالت میں دیکھا۔ سیّدنا حمزہ بن عبدالمطلب ؓ شہید ہوئے‘ وہ مجھ سے بہتر اور افضل تھے‘ پھر ہمیں دنیا سے وہ کچھ دیا گیا جو کچھ دیا گیا۔ (یعنی ہمیں بے حد و حساب دولت دی گئی) حتیٰ کہ ہمیں ڈر لگا کہ ہماری نیکیوں کا بدلہ ہمیں فوراً (دنیا ہی میں) دے دیا گیا ہے۔ یہ کہہ کر آپؓ زار وقطار رونے لگے اور کھانا چھوڑ دیا۔

مالی ایثار

سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ اُمہات المؤمنینؓ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اُمہات المؤمنین ؓ کو بیت المال سے معقول مقدار میں خرچ ملتا تھا‘ اس کے باوجود بہت سارے غنی صحابہؓ آپؓ کے ایک ادنیٰ اشارے پر ہر قسم کی مالی قربانی دینے کے لیے ہر آن ہر گھڑی تیار رہتے تھے۔ مگر عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کا معاملہ سب سے مختلف تھا۔ آپؓ کے ایک باغ کی قیمت چار لاکھ درہم تھی‘ آپؓ نے اس کی پیداوار اُمہات المؤمنینؓ پر خرچ کرنے کی وصیت فرمائی۔ آپؓ

نے بدری صحابہؓ کے لیے وصیت کی تھی کہ ان میں سے جو زندہ ہیں ان سب کو میری وفات کے بعد میراث سے چار چار سو دینار دیے جائیں۔ جب ان کی وفات کے وقت بدری صحابہؓ کو گنا گیا تو ان کی تعداد ایک سو تھی۔ اس طرح چالیس ہزار دینار کی خطیر رقم صرف بدری صحابہؓ کو ادا کی گئی۔ ان صحابہؓ میں سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ سبھی کو معلوم تھا کہ آپؓ نہایت امیر کبیر اور مالدار انسان ہیں۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے یہ کوئی بڑی رقم بھی نہ تھی' آپؓ تو غنی تھے۔ جب آپؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپؓ بھی حسبِ وصیت رقم وصول کریں گے؟ تو انہوں نے فرمایا: ''ہاں! کیوں نہیں! میں یہ رقم ضرور وصول کروں گا۔ میرا یہ بھائی بڑا بابرکت تھا۔ اس کا مال حلال اور برکت والا ہے''۔ اس طرح آپؓ نے بھی چار سو دینار وصول کیے۔

مشیرِ خاص

جب سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سیّدنا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے مجوسی غلام ابولؤلؤ فیروز نے فجر کی نماز پڑھاتے ہوئے خنجر گھونپا تو آپؓ نے سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں اپنی جگہ کھڑا کر دیا۔ لوگ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی آواز نہیں سن رہے تھے' وہ سبحان اللہ' سبحان اللہ کہہ رہے تھے۔ چنانچہ سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مختصراً نماز پڑھائی۔ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جن شخصیات کے بارے میں فرمایا کہ ان کو میرے بعد خلیفہ چُن لینا ان میں سیّدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ جب شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا تو یہ مسئلہ بڑا مشکل تھا کہ کس کو خلیفہ منتخب کیا جائے۔ مگر انہوں نے یہ مسئلہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا اور آخر کار صحابہؓ کے مشورے سے سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرّر کرنے کا اعلان کر دیا۔ آپؓ سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُن کا مکمل ساتھ دیتے رہے۔ انہیں خیر خواہی کے ساتھ نیک مشورے دیتے رہے اور آپؓ زندگی بھر نظامِ خلافت کے استحکام کے لیے کوشاں رہے۔

وفات

آپؓ کی وفات سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ وفات کے وقت آپؓ کی عمر ۷۲ برس کے لگ بھگ تھی۔

❁❁❁

رمضان اور معاشرتی ماحول

استقبالِ رمضان کے حوالے سے خصوصی تحریر

مسز بینا حسین ☆

کسی بھی نظریے‘ عقیدے اور طرزِ فکر کو پھلنے پھولنے‘ پروان چڑھنے اور عمل کا حصّہ بننے کے لیے ایک معاشرے میں خارجی ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس معاشرے کے اجتماعی ماحول میں عقائد و نظریات کی حفاظت کی جاتی ہو اور اخلاقی و دینی ضابطوں کی پاسداری کی جاتی ہو اور ان ضابطوں کو توڑنے پر افرادِ معاشرہ میں مذمت کا خوف پایا جاتا ہو‘ وہاں نیکی اور اچھائی پھلتی پھولتی ہے اور برائی دب کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جہاں برائی کو قبول کیا جاتا ہو‘ دینی حدود و قیود پامال کی جاتی ہوں‘ عقائد و نظریات پر حملہ کرنے والے عناصر پھل پھول رہے ہوں وہ معاشرے اپنے افراد کی بیمار ذہنیت کے عکاس ہوتے ہیں۔

پاکستانی معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ ہے‘ یہاں دین اسلام ایک نظریۂ حیات اور عقیدے کا نام ہے۔ اس عقیدے کو افراد کے عمل کا حصّہ بننے اور پھلنے پھولنے کے لیے ایک ایسے خارجی ماحول کی ضرورت ہمیشہ رہی ہے جہاں بحیثیت مجموعی پورا ہی معاشرہ دین اسلام سے گہری عقیدت رکھتا ہو اور افرادِ معاشرہ اپنے کردار و عمل سے اسلام پسندی کا ثبوت دیں‘ کیونکہ اسلام درحقیقت ایمان کے عملی اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔

افرادِ معاشرہ کو عمل و عقائد کی وحدانیت کی ترغیب دینے میں جہاں دینی جماعتیں اور تحریکیں اپنا کردار ادا کر سکتی ہیں وہاں اربابِ اقتدار بھی بذریعہ قوت (یعنی قانون کی بالادستی) معاشرے میں ایسا خارجی ماحول پیدا کر سکتے ہیں کہ منبر و محراب جس برائی کو برائی قرار دے‘ قانون و انتظام کی ساری طاقتیں بھی اس برائی کو بذریعہ طاقت روک لیں۔ لیکن جہاں یہ طاقتیں وحدت کے بجائے مخالفت کا رویہّ اپنا لیں تو معاشرے کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔

☆ایڈووکیٹ‘ صادق آباد

اداروں میں کرپشن اور لوٹ مار ناقابل گرفت ہو جاتی ہے۔ اخلاقی زوال کاروبارِ معیشت‘ سیاست‘ حکومت اور تمام بڑے شعبوں میں اپنا رنگ دکھانے لگتا ہے۔ ایسی صورتحال میں تمام مادّی ترقیاں جن کو حکومت اپنا بڑا کارنامہ گردانتی ہے‘ صفر ہو کر رہ جاتی ہیں‘ کیونکہ کرپشن کی موجودگی میں یہ عارضی اور بے ثمر ثابت ہوتی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ حکومتوں کو عوام الناس کے عقائد و اخلاقیات کی اصلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ حدودِ حلال و حرام‘ حرمت و تقدس‘ روحانی ترقی‘ فلاحِ اُخروی جیسے فلسفے حکومتِ وقت کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان فلسفوں کا برائے نام وجود باقی رکھنے کے لیے اگر حکومت کچھ کرتی بھی ہے تو بس اتنا کہ مذہبی امور نبٹانے کے لیے ایک ادارہ بنا دیا جاتا ہے‘ شرعی عدالتوں اور اسلامی نظریاتی کونسل قائم کر کے ایک اونچے طاق پر سجا دی جاتی ہیں۔ گویا ایک خوبصورت کھلونا......بس دور سے بیٹھے دیکھا کیجیے۔ عام آدمی کی پہنچ سے بہت دُور یہ ادارے جن کے بارے میں شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان اداروں کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اور عام آدمی ان سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتا ہے! اسلامی معاشرے کا خارجی ماحول بنانے میں یہ ادارے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

کچھ زیادہ پرانی بات نہیں...... یہی کوئی بیس پچیس سال پہلے کے پاکستانی معاشرے میں جھانکئے۔ رمضان المبارک کا چاند نظر آتے ہی ہمارے معاشرے کا خارجی ماحول یکا یک تبدیل ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ رمضان کا چاند نہیں بلکہ وہ سماجی رویّے تھے جو اس مہینے سے وابستہ حرمت و تقدس کو محسوس کرواتے تھے۔ بچوں کی ٹولیاں نعتیں پڑھتی ہوئی جلوس کی شکل میں ہر گلی ہر محلّے سے گزرتی تھیں‘ مسجدوں میں سحری کا اہتمام ہوتا تھا‘ مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکرز سے نشر ہونے والی نعتیں اور تلاوت دلوں میں حلاوت پیدا کرتی تھیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے حوالے سے چھائی ہوئی غفلت دور ہو جاتی تھی۔ پڑوسیوں اور رشتے داروں کے مابین سماجی روابط بحال ہو جاتے تھے۔ رنجشیں دور اور گلے شکوے ختم کیے جاتے تھے۔ گلی محلّوں میں دنگا فساد اور داداگیری کرنے والے بھی جب سر پر ٹوپی اور وضو کے پانی کے قطرے جھاڑتے ہوئے مسجد کا رخ کرتے نظر آتے تھے تو یقین ہو جاتا تھا کہ رمضان المبارک توبہ استغفار کا مہینہ ہے کہ اللہ جس کو معاف کرنا چاہتا ہے اسے توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ افطاری کے وقت محلّے داروں کے مابین انواع و اقسام کے کھانوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ رزق کی یہ فراوانی دیکھ

کر اس حدیث مبارکہ پر یقین اور بھی پختہ ہو جاتا تھا کہ رمضان المبارک برکتوں کا مہینہ ہے۔ زائد کھانا مسجدوں میں سحری کے لیے بھجوا دیا جاتا تھا۔ مسافروں‘ محتاجوں اور مساکین کی مزاج پُرسی کی جاتی تھی۔ افطار پارٹیاں مسجدوں میں رکھی جاتی تھیں تاکہ ہر کوئی بلاتخصیص ذات برادری‘ اچھے کھانے سے مستفید ہو سکے۔ آج افطار پارٹیوں میں صرف ان کو بلایا جاتا ہے جن سے ہمارے دنیاوی اغراض ومقاصد یا قرابت داری کے رشتے جڑے ہوتے ہیں۔ اب خودغرضی اور ریاکاری کے اس ماحول میں ’’للّٰہیت‘‘ اور مخلوقِ خدا کی بے غرض و بے لوث خدمت کا جذبہ بھلا کیسے پیدا ہو سکتا ہے!

سحری کے وقت سے ذرا پہلے رات کی خاموشی میں زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑا کر آواز لگائی جاتی تھی: ’’روزے دارو! اللہ کے پیارو! جلدی جلدی سحری کا انتظام کرلو‘‘۔ محلے کے کچھ بزرگ رضاکارانہ طور پر سحری کے لیے جگانے کی یہ ذمہ داری ادا کرتے تھے۔ نیند خراب ہونے پر نہ کوئی منہ بناتا تھا نہ ہی کسی کو ایسی جرأت ہوتی تھی کہ ان بزرگوں کو منع کر سکے‘ بلکہ بزرگوں کے احترام کا ماحول پیدا ہوتا تھا۔ عبادت کی طرف دعوت دینے والے ان بزرگوں کو اہلِ محلّہ عید کے لیے سوٹ گفٹ کرتے تھے اور ان کی دعائیں لیتے تھے۔ جو روحانی خوشیاں ایسے خارجی ماحول کی وجہ سے دلوں کو طمانیت پہنچاتی تھیں‘ آج معاشرہ ان سے محروم ہے۔ مہنگائی اُس وقت کم تھی‘ نیتوں میں اخلاص تھا‘ غریب اور متوسط طبقے کے لوگ بھی انفاق فی سبیل اللہ میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے‘ نیکیوں کی طرف سبقت کا ماحول پروان چڑھتا تھا۔

میری (راقمہ کی) والدہ مرحومہ سال بھر وہ کپڑے اور تحائف جو عام طور پر شادی بیاہ میں شمولیت کی وجہ سے ملتے ہیں‘ جمع کرتی رہتی تھیں اور رمضان المبارک میں ایک دو نہیں بلکہ کئی مساکین اور محتاجوں کو نیا کپڑا پہنانے کی سعادت حاصل کرتی تھیں۔ اور وہ بڑی چادریں اور بڑے بڑے دوپٹے جو گرمی کی وجہ سے روزمرہ استعمال میں نہیں آتے تھے ان سے چھوٹی بچیوں کے سوٹ سی لیا کرتی تھیں اور محلے کی غریب بچیوں کو ہمارے (راقمہ) ذریعے تحفے کے طور پر بھجوایا کرتی تھیں۔ ایسے ماحول میں چھوٹے بچوں میں بھی راہِ خدا میں خرچ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مٹّی کی گولک کی سوندھی سوندھی خوشبو...... دو اور پانچ روپے کے سکّوں کی کھنکھناہٹ‘ بھلا کون بھول سکتا ہے! عید سے دو چار روز قبل یہ گولک توڑی جاتی تھی۔ سکّے گنوائے

جاتے تھے اور عید کے روز عیدگاہ جاتے ہوئے رستے میں ملنے والے محتاجوں اور فقیروں میں بچے اپنی یہ جمع پونجی خیرات کیا کرتے تھے۔ نجانے بچوں کی یہ معصومیت آج کہاں چلی گئی! روزے کی حالت میں بھوکے پیاسے رہنے سے نادار ومفلس لوگوں کی بھوک پیاس کا احساس پیدا ہوتا ہے‘ یہ بات اپنی جگہ درست ہے‘ لیکن مساکین کی مدد کا جو جذبہ خارجی ماحول کے ذریعے پیدا ہوتا ہے وہ انسان کے عادات وکردار کا حصّہ بن جاتا ہے۔

رمضان المبارک میں معاشرے کے خارجی ماحول کو پُرتقدس بنانے کے لیے محلّے کی مسجد کا لاؤڈ اسپیکر بھی اہم کردار ادا کرتا تھا۔ جمعہ کے خطبات میں روزے اور رمضان کے فضائل‘ روزہ نہ رکھنے پر عذاب کی تنبیہہ‘ انفاق کی برکات اور روزے کے مسائل پر درس و بیانات دیے جاتے تھے۔ محلّے کے ہر فرد تک یہ دروس پہنچتے تھے۔ کھڑے بیٹھے لیٹے‘ گھریلو کام کاج‘ تجارت‘ دکانداری یہاں تک کہ کھیتی باڑی کرتے ہوئے ہر آدمی تک بات پہنچ جاتی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے پورا مہینہ اللہ کے ذکر اور قرآن کی تلاوت کی رونق رہتی۔ شرپسندوں کو جرأت ہی نہ ہو پاتی تھی کہ رمضان المبارک میں کسی برائی کے لیے دلیر ہو جائیں۔ پی ٹی وی پر افطاری کے وقت نشریات معطل رہتی تھیں۔

آج ہمارے خارجی ماحول میں ایمان کو متزلزل کرنے والے بے شمار عوامل وعناصر جابجا پائے جاتے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عریانی پر مبنی اشتہارات پورا رمضان چلتے رہتے ہیں۔ ٹاک شوز میں بے ہودہ اور لچر گفتگو‘ ایوننگ اور مارننگ شوز میں مرد و زن کا بے باکانہ‘ بے حجابانہ اختلاط‘ یہاں تک کہ رمضان ٹرانسمیشن کے نام پر جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا جاتا ہے اس سے نئی نسل کے ذہن میں رمضان کا تصوّر ایک فیسٹیول کے طور پر بیٹھ چکا ہے۔ فحاشی‘ عریانی اور لبرل ازم کی طرف دعوت دینے والے ان چینلز کو تو کبھی بند نہ کیا گیا‘ لیکن مساجد کے لاؤڈ اسپیکرز کو یہ عذر تراشتے ہوئے بند کروا دیا گیا کہ ان کے ذریعے فرقہ واریت پھیلتی ہے۔ ۲۰۰۱ء میں پرویز مشرف کے دور میں ایمپلی فائر ایکٹ نافذ العمل ہوا جو آج تک جاری ہے۔ اس پابندی سے ایک نقصان یہ ضرور ہوا کہ رمضان المبارک کی حرمت اور تقدس کو برقرار رکھنے والا خارجی ماحول ہم سے چھن گیا۔

❁❁❁

خوش گوار ازدواجی زندگی: راہنما اصول

مولانا عبدالمتین

خطبہ نکاح کا اصل پیغام

ہم اکثر نکاح کا خطبہ سنتے ہیں‘ لیکن کیا کبھی غور کیا گیا ہے کہ اس خطبے میں کہا کیا جا رہا ہے۔ خطبہ نکاح میں حمد وصلوٰۃ کے بعد قرآن کریم کے جن تین مقامات سے تلاوت کی جاتی ہے ان میں حیرت انگیز طور پر نکاح کا کوئی تذکرہ ہی نہیں‘ بلکہ تینوں جگہ ایک ہی مضمون پر زور دیا گیا اور وہ ہے ''تقویٰ''۔ یہ ایک ایسا مؤثر عنوان ہے جس کے تحت بہت سے مسائل خود ہی حل ہو جاتے ہیں۔

نبی اکرمﷺ نکاح کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا کرتے‘ اس کے لیے قرآن مجید سے ایسی آیات منتخب فرماتے جن میں تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے۔ درحقیقت مسنون خطبہ نکاح میں تقویٰ اور پرہیز گاری کی تاکید فرما کر اس جانب توجہ دلائی گئی کہ زوجین اپنی زندگی کو خوش گوار اور گھر کو پُرسکون اُسی وقت بنا سکیں گے جب ان دونوں کو اپنے ہر عمل کی جواب دہی کی فکر لاحق ہو۔ اللہ کے ہاں باز پُرس کا احساس وہ واحد پیمانہ ہے جس سے سچائی اور امانت کا معیار ناپا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا شعور باقی نہ رہے تو دنیا کی کوئی عدالت‘ برادری یا خاندان ان دونوں کو جوڑ نہیں سکتے۔ یہ ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق ہے۔ رحمی رشتوں میں تو سوتیلے پن کی گنجائش نکل آتی ہے لیکن یہاں ایسا ممکن نہیں۔ دوسرے تعلقات شاید مصنوعی پن یا جھوٹ کے سہارے بھی چلائے جا سکتے ہوں لیکن یہ تعلق سچائی اور دیانت داری کے بغیر ایک مردہ جسم کی مانند بن جاتا ہے۔

گھر کا سکون

اللہ ربّ العزت نے اس دنیا میں انسانی رشتوں کی ابتدا میاں بیوی کے درمیان تعلق قائم کر کے فرمائی۔ اس رشتے کے مقاصد اور اسے پختہ کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں‘ اس حوالے سے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا

وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ﴾ (الروم:۲۱)

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک اہم نشانی یہ ہے کہ اُس نے تمہارے ہی وجود سے تمہارے لیے جوڑے پیدا فرمائے تاکہ تم اس جوڑی کے ذریعے سکون حاصل کر سکو اور تمہارے درمیان اپنی قدرت سے محبّت اور رحمت کا بیج بو دیا۔''

اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے تعلق کو سکون کے خزانے کی چابی قرار دیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ انسان کے لیے سکون کا اصل مرکز اُس کا اپنا گھر ہونا چاہیے۔ اگر گھر میں سکون کی فضا نہ رہے تو وہ محض اینٹ‘ پتھر اور نقش ونگار سے مزین ایک مکان بن کر رہ جائے گا‘ جس میں ہر طرف افسردگی اور غمزدگی چھائی ہو گی۔ ایسے میں انسان کسی ہوٹل‘ کلب‘ دوستوں کی محفل اور دیگر مصنوعی سرگرمیوں کے ذریعے سکون حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جسے اپنے گھر میں سکون نہیں مل سکتا‘ وہ دنیا کے کسی کونے میں بھی پُرسکون نہیں رہ سکتا۔

گھریلو سکون کو قائم کرنے اور اسے بحال رکھنے کے حوالے سے چند امور پیش نظر رکھنا لازمی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق مرد کی ذِمہ داریوں سے ہے اور بعض کا تعلق عورت کے فرائض سے ہے۔

زوجین کا رشتہ: قرآن کی روشنی میں

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''وہ تمہارے لیے لباس کی مانند ہیں اور تم ان کے لیے لباس کی مانند ہو۔''

اللہ ربّ العزت نے اس تعلق کو ایک انتہائی بلیغ تشبیہ دے کر سمجھایا ہے کہ میاں بیوی فقط رسمی تعلق کا نام نہیں۔ لباس انسانی بدن کے لیے کئی اعتبار سے اہم ہے‘ مثلاً ستر‘ عزّت‘ تحفظ‘ زینت‘ صحت‘ تہذیب وغیرہ۔ یعنی جس طرح لباس ہمارے لیے ستر پوشی کا ذریعہ ہے اسی طرح یہ رشتہ بھی ہمارے عیوب کی پردہ پوشی کا ذریعہ ہے۔ جس طرح لباس کی زینت انسان کو عزّت بخشتی ہے ٹھیک اسی طرح میاں بیوی کا معاملہ ہے کہ معاشرے میں ان کا مقام اور حیثیت ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ جس طرح لباس ہمیں موسمی اثرات سے محفوظ رکھتا ہے اسی طرح زوجین میں ہر ایک کے ذِمہ ہے کہ وہ دوسرے کو زندگی کی تلخیوں اور مصائب کے اثرات سے

بچانے کی کوشش کرے۔ اس حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ہمارے لباس پر اگر راہ چلتے کوئی کیچڑ‘ گند یا داغ لگ جائے تو ہم اس پوشاک کا استعمال ترک کرنے یا اسے رد کرنے کے بجائے بہت خیال کے ساتھ داغ کو فوری طور پر صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح میاں بیوی کو بھی چاہیے کہ انسانی فطرت کے سبب اگر کوئی اَن بن‘ جھگڑا‘ اختلاف یا ناراضگی ہو جائے تو گھریلو سکون کا خیال رکھتے ہوئے اس نزاع کو فوری حل کرنے کی کوشش کریں۔

درحقیقت یہ رشتہ ذِمّہ داریوں کی تقسیم کا معاملہ ہے۔ اس تعلق کی کامیابی کے لیے سارا بوجھ کسی ایک فریق پر نہیں ڈالا جاسکتا۔ انسان خطا کا پتلا ہے اور انسان کا نام ہی نسیان سے ماخوذ ہے۔ اس کی فطرت میں بھلکڑ پن اور غلطیاں کرنا موجود ہے۔ انسان ہونے کے ناطے دونوں کو اپنی کارکردگی پر نظر رکھنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم‘ احادیث مبارکہ اور ماہرین فقہ نے دونوں کی ذِمّہ داریوں کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

شکایات کا حل

اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ سمجھنے کی ہے کہ ہر جوڑا شکایات کی ایک طویل فہرست ذہن میں لیے پھرتا ہے اور جہاں کہیں موقع ملے‘ اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیتا ہے۔ رشتہ ٹھیک جگہ نہ ہونا‘ خدمت میں کوتاہی‘ گالم گلوچ‘ مار پیٹ‘ طعنے‘ رہائش غرض ہر طرح کی شکایتیں سننے کو ملتی ہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی برائیاں سامنے آجانے کے بعد آپ کا فیصلہ کیا ہے! آیا ان خرابیوں کی وجہ سے آپ یہ رشتہ ختم کرنا چاہتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو شریعت نے ہر دو کو یہ موقع دیا ہے‘ تاکہ کوئی انسان اپنی زندگی کا سکون غارت نہ کرے بلکہ خلع یا طلاق کے اختیارات استعمال کر کے علیحدہ ہو جائے اور ایک نئی زندگی شروع کرے۔ تاہم حیرت انگیز طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ اکثریت اس اختیار کو استعمال کرنے کے بارے میں نہیں سوچتی۔ اس رجحان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زوجین ایک دوسرے کے ساتھ رہنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایسے میں یہ بات بہت اہم ہے کہ جب آپ نے ساتھ ہی رہنا ہے تو پھر شکایات اور اعتراضات کا بھاری بوجھ اٹھانے کے بجائے معاملات کو حل کرنے کی طرف آئیں۔ ایک دوسرے پر اعتراض کرنے کے بجائے یہ سوچیں کہ مسائل حل کیسے ہوں گے! ہم ایک دوسرے کے ساتھ زندگی کو بہتر کیسے بنا سکتے ہیں! گھر کے ماحول کو پُرسکون کیسے رکھا جاسکتا ہے! یہ امر ذہن میں راسخ کیا جائے کہ شکایتوں‘ غیبت‘ بہتان اور گالم گلوچ سے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

بیوی کی ذِمّہ داریاں

☆ امورِ خانہ داری

بیوی کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کو اپنی زندگی کا محور بنائے اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اپنے گھر کو جنت بنانے میں صرف کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے زیادہ وسائل کی ضرورت نہیں ہوتی‘ بلکہ صاف نیت اور پختہ ارادہ اہم ہیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بیوی خاتونِ خانہ بنے‘ شمعِ محفل نہ بنے۔ آج یہ بات سمجھنا ذرا مشکل ہو گیا ہے‘ کیونکہ لڑکیاں بھی اعلیٰ اور پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول میں پیش پیش ہیں۔ جب ایک خاتون ڈاکٹر‘ انجینئر یا بینک آفیسر سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے گھر پر زیادہ توجہ دیں تو ان کو مشورہ دینے والا تنگ نظر دکھائی دیتا ہے۔

لڑکیاں تعلیم حاصل ضرور کریں اور ایسے شعبوں میں جہاں خواتین ماہرین کی ضرورت ہے وہاں اپنی خدمات بھی پیش کریں‘ لیکن ان کی پہلی ترجیح اپنا گھر ہونی چاہیے نہ کہ کیریئر۔ عام مشاہدہ یہی ہے کہ جب میاں اور بیوی دونوں معاش کے سلسلے میں گھر سے باہر ہوں تو پھر بچوں کی دیکھ بھال اور امورِ خانہ داری کے لیے کسی ملازمہ سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ملازمہ کے پکائے گئے کھانے سے پیٹ تو بھر جائے گا لیکن گھر کے افراد میں محبت‘ اُنس اور خلوص کا رشتہ قائم نہیں ہوگا۔ اسی طرح خادمہ بچوں کے کام چاہے کتنی ہی دیانت داری سے کیوں نہ کرے‘ اس میں مامتا کے جذبات کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔

گھر داری درحقیقت ایک طویل جدوجہد کا نام ہے جس کے اثرات نسلوں تک پہنچتے ہیں۔ مشہور ہے کہ ایک خاتون نے کسی عالم دین سے پوچھا: ’’جتنے بھی انبیاء آئے ہیں وہ سب مرد ہیں۔ اللہ نے عورتوں کو نبی بنا کر کیوں نہیں بھیجا؟‘‘ جواب میں عرض کیا گیا کہ عورتیں نبی بن کر تو نہیں آئیں لیکن انبیاء کو جنم خواتین ہی نے دیا ہے۔

☆ نبوی لائحہ عمل

نبی کریم ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ میں بیویوں کو ایک مختصر مگر جامع نصاب کی طرح ان کی ذِمّہ داریاں بتائی گئی ہیں۔ فرمایا:

((اِذَا صَلَّتِ الْمَرْاۃُ خَمْسَهَا‘ وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَحَصَّنَتْ فَرْجَهَا‘ وَاَطَاعَتْ بَعْلَهَا‘ دَخَلَتْ مِنْ اَیِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ)) (المعجم الاوسط للطبرانی)

''ایک عورت جب پنج وقتہ نماز کی پابندی کرے‘ رمضان کے روزے رکھے‘ اپنی عزّت وعصمت کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی اطاعت کرے تو وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہوجائے۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ نے خواتین کی چار ذِمہ داریاں بتائی ہیں:

(۱) فرض نماز کی ادائیگی (۲) فرض روزے رکھنا

(۳) اپنی عزّت وعصمت کی حفاظت (۴) شوہر کی اطاعت

اس حدیث میں آپ ﷺ خواتین کو بہت بڑی بشارت سنا رہے ہیں کہ جنّت کے تمام دروازے ان کے لیے کھل سکتے ہیں۔ اس کے لیے کسی لمبی چوڑی عبادت کا نہیں کہا جا رہا ہے‘ بلکہ فقط چند فرائض کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ اس میں آخری بات اپنے شوہر کی اطاعت ہے اور اس کے تحت وہ تمام کام آجاتے ہیں جو ایک بیوی اپنے گھر میں انجام دیتی ہے۔

یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ جن کاموں کو خواتین خالص دنیوی یا رسمی سمجھتی ہیں اور بعض اوقات مجبوری کے تحت کرتی ہیں انہیں دینِ اسلام ایک عظیم عبادت قرار دے کر اس کے بدلے میں اتنی بڑی بشارت سنا رہا ہے۔ اس حوالے سے خواتین کو چاہیے کہ وہ شکر کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی فطرت سے نوازا ہے جو بڑی قربانیاں دے سکتی ہے۔ لہٰذا قربانی دینے کے بعد یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے ثواب کو بچاتے ہوئے شکایت کو اپنی زبان پر نہ لائیں بلکہ اللہ نے جو بھی دیا ہے اس کے ذریعے اپنے گھر کو خوش حال اور پُرسکون رکھیں۔

مَردوں کی ذِمّہ داریاں

مزاج شناسی

☆ شریعت میں بیویوں کے حقوق سے متعلق جو ہدایات ہیں ان میں عمومی طور پر یہ طرزِ فکر پایا جاتا ہے کہ خواتین کا مزاج سمجھا جائے اور ان سے اسی مناسبت سے توقعات رکھی جائیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ خواتین کے حوالے سے تین باتوں کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے:

۱۔ تحفظ ۲۔ عزّت ۳۔ حوصلہ افزائی

۱) بیوی اپنے شوہر سے ایک بھرپور امید اور توقع یہ رکھتی ہے کہ میری اور میرے بچوں کی مکمل ذِمہ داری میرا شوہر ادا کرے گا۔ وہ رہائش اور دیگر ضروریات کی فکر کیے بغیر اپنے گھر کو سنبھالتی ہے۔ اس کے لاشعور میں یہ امر جاگزیں ہوجاتا ہے کہ اس دنیا میں اب میرا کوئی بھی نہیں سوائے میرے شوہر کے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے شوہر سے بے پناہ توقعات رکھتی ہے۔ اسی لیے وہ سوتن سے ڈرتی ہے‘ کیونکہ اُسے یہ خوف ہوتا ہے کہ دوسری عورت اس کے تحفظ میں رکاوٹ بن جائے گی۔

۲) بیوی عزّت چاہتی ہے‘ اپنی‘ اپنے بچوں کی‘ اپنے والدین اور رشتہ داروں وغیرہ کی۔ اُسے عزّت نہ ملے تو وہ تھوڑا کام کر کے بھی خود کو محض ایک ملازمہ تصور کرتی ہے‘ جبکہ دوسری صورت میں وہ اپنی جان کھپا کر بھی فخر کے جذبات رکھتی ہے۔

۳) بیوی کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہے‘ بلکہ علماء فرماتے ہیں کہ عورت چاہے کسی بھی روپ میں ہو وہ ہمیشہ اس کی طالب رہتی ہے۔ یہ اُس کی فطری چاہت ہے جسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اُس کی یہ خواہش جائز طریقے سے پوری نہ ہو تو بعض اوقات وہ ناجائز حوصلہ افزائی کی طرف بھی متوجّہ ہوسکتی ہے۔ اسی لیے اس کی خانہ داری‘ خوب صورتی اور خوب سیرتی کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے۔

گھر کا ماحول

رسول اللہ ﷺ کی ایک پیاری حدیث ہے۔ فرمایا:

((خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِهٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ)) (سنن الترمذی)

''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو‘ اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب میں سب سے زیادہ اچھا ہوں۔''

شوہر کو چاہیے کہ گھر میں تُندخو اور سخت مزاج بن کر نہ رہے‘ بلکہ اہل خانہ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ کوئی شخص باہر چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر گھر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں کرتا تو وہ حقیقت میں بُرا ہے۔ اُسے چاہیے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ نیک رویہ اس نیت سے رکھے کہ یہ بھی عبادت کا حصہ ہے اور مجھے اس حسنِ سلوک پر نیکیاں مل رہی ہیں۔

اہل خانہ کی تربیت

یہ امر باعثِ افسوس ہے کہ مرد حضرات اپنے گھر میں اچھا ماحول تو دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ایسے ماحول کی آبیاری کے لیے شعوری طور پر کوئی کوشش نہیں کرتے۔ مرد اگر چاہے تو تھوڑی سی محنت سے گھر میں ایک خوب صورت ماحول تشکیل دے سکتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں سے کپڑوں‘ کھانے‘ صفائی ستھرائی اور آرام کے مطالبے تو کرتا ہے لیکن نماز کے متعلق نہیں پوچھتا۔ یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا کہ کون روزانہ قرآن مجید کی تلاوت کا اہتمام کرتا ہے! شاپنگ اور سیر وتفریح کے لیے تو لے جاتا ہے لیکن نیکی کی کسی مجلس میں نہیں لے جاتا۔ اگر سب گھر والے روزانہ صرف دس منٹ بھی اجتماعی طور پر کسی دینی کتاب کا مطالعہ کرلیں تو اس سے حیرت انگیز فوائد دیکھنے کو ملیں گے‘ ان شاء اللہ!

ایک اہم معاملہ

ایک اہم مگر قدرے مشکل کام جو مرد حضرات کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اپنی زوجہ کو الگ سے وقت دیں‘ ایسا وقت جو آرام اور کھانے پینے کے علاوہ ہو۔ اس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے کھلے دل کے ساتھ ہر وہ بات شیئر کریں جو دل چاہے اور اس کے اظہار میں کوئی بھی پابندی نہ ہو۔ ایک طرح سے زوجین آپس میں معاہدہ کرلیں کہ ہمارے بیچ کوئی بھی مسئلہ ہو‘ ہم دوسرے کسی بھی فرد کو بیچ میں لائے بغیر بلاتردّد اُسے ایک دوسرے سے ذکر کریں گے۔ عین ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے مرد کو اپنی ماں‘ بہن کے متعلق بہت سی تلخ باتیں سننے کو ملیں‘ لیکن وہ یہ سوچ ذہن میں رکھے کہ اُس کی بیوی کے ذِمّہ خدمت‘ رضاعت‘ حمل‘ تربیت کی بہت سی ذِمّہ داریاں ہیں‘ جن کی ادائیگی وہ طعن وتشنیع ہونے کے باوجود بھی جاری رکھتی ہے‘ لہٰذا اس وقت میں اگر اس کی بات نہیں سنوں گا تو اور کون سنے گا! اس عمل میں یہ احتیاط لازم ہے کہ وہ فقط سنتا جائے لیکن اس پر کسی ردِّعمل کا اظہار نہ کرے‘ ورنہ اپنے بیوی بچوں کی فکر میں وہ حدِاعتدال سے نکل کر والدین اور بھائی بہنوں کے حقوق غصب کرنے کے بارے میں سوچے گا۔ ٹھیک اسی طرح جب اپنی والدہ کے پاس جائے تو وہاں بھی اہلیہ کے متعلق فقط سننے پر ہی اکتفا کرے۔ اگر ردِّعمل کا اظہار کرے گا تو اپنے گھر سمیت خود بھی اندر سے ٹوٹ جائے گا۔

خواتین اور مردوں کے مزاج کا فرق

ایک اہم بات یہ ہے کہ صرف اپنی بیوی ہی کی نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی خواتین کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن کریم میں اللہ ربّ العزّت نے خواتین کے لیے ایک مقام پر ”غَافِلَات“ کا صیغہ ذکر کیا ہے۔ مَردوں میں غفلت کا مفہوم بے پروائی یا اپنی ذِمّہ داریاں پوری طرح ادا نہ کرنا ہے‘ لیکن جن معنوں میں عورتوں کے لیے لفظ ”غافلات“ استعمال ہوا ہے اس کا معنی ہے بھولی بھالی یا ایسی عورت جو حد درجہ ہوشیاری نہ جانتی ہو بلکہ سیدھی سادی اور انتہائی مخلص مزاج ہو۔ وہ ہر بات کو اس کی فلسفیانہ وجوہات اور تہہ میں جا کر سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتی ہو۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ ایسی فطرت کی حامل مخلوق سے مرد بار بار یہ شکایات کرتا نظر آتا ہے کہ: تم بات کیوں نہیں سمجھتی؟ تمہیں عقل کیوں نہیں ہے؟ تم ایک ہی بات بار بار کیوں کہتی ہو؟ تم تو پیچھے ہی پڑ گئی ہو؟ یہ سارے وہ جملے ہیں جن میں مرد اپنی بیوی سے انتہا درجے کی دانش مندی کی توقع رکھتا ہے‘ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس نہج پر بنایا ہی نہیں ہے۔ کچھ خواتین جو واقعی علم وعقل اور شعور ودانش کی اعلیٰ سطح پر قائم رہتی ہیں‘ وہ ایک استثنائی صورتِ حال ہے۔

نبی اکرم ﷺ اپنی ازواجِ مطہراتؓ کے کس قدر مزاج شناس تھے‘ اس حوالے سے آپ ﷺ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ فرماتے ہیں: ”عائشہ! جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو یا ناراض ہوتی ہو تو مجھے پتہ چل جاتا ہے“۔ پوچھا گیا: کیسے؟ نبی اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ”جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو کہتی ہو: ”وَرَبِّ مُحَمَّدٍ ﷺ“ (محمد ﷺ کے رب کی قسم) اور جب تم ناراض ہوتی ہو تو کہتی ہو: ”وَرَبِّ اِبْرَاهِيْم“ (ابراہیم کے رب کی قسم)۔ اس پر اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا: لَا اَهْجُرُ اِلَّا اسْمَكَ (ناراضگی کے عین موقع پر بھی میں فقط آپؐ کا نام چھوڑتی ہوں‘ باقی دل میں آپؐ کی محبت برقرار رہتی ہے۔)

یہ کچھ گزارشات ہیں جن کی زوجین کو ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ شادی سے پہلے نوجوان جوڑے ان اصولوں سے واقف ہوجائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربِّ العالمین!

کھانے پینے کے آداب

اور نبی اکرم ﷺ کے پسندیدہ کھانے

حافظ محمد زاہد

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے' یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر چیز کے متعلق احکامات اور آداب پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ کھانا پینا انسان کی فطری اور مادی ضرورت ہے اور انسان کی بقا کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسلام نے اس کے بارے میں احکامات بھی صادر فرمائے ہیں اور اس کے آداب بھی بتائے ہیں۔ یہ آداب ایسے ہیں جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں اور اخلاقی لحاظ سے بھی بہت اعلیٰ و ارفع ہیں۔ ان آداب میں سے بعض کا تعلق اللہ کے ذکر و شکر سے ہے اور بعض کا تعلق طبّی مصلحت اور سلیقہ و وقار سے ہے۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان آداب کی شرعی حیثیت واجب یا فرض کی نہیں ہے' بلکہ ان میں سے بعض کی حیثیت سُنّت اور بعض کی حیثیت مستحب کی ہے' لیکن یہ یاد رہے کہ ان آداب کی رعایت رکھنے سے ایک طرف تو بہت سے طبّی اور معاشرتی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور کھانے پینے کی اشیاء میں برکت ہوتی ہے تو دوسری طرف ان آداب کی رعایت رکھنے سے یہ مادی عمل بھی ثواب اور تقربِ الی اللہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اب ہم ان آداب کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

کھانے پینے کی اشیاء میں اسراف کی ممانعت: قرآن کریم میں کھانے پینے کے متعلق یہ حکم جابجا ملتا ہے کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور حرام سے بچو۔ اور پھر ان حلال اور پاکیزہ چیزوں کے استعمال کے بارے میں یہ حکم بھی قرآن میں موجود ہے کہ اس میں اسراف نہ کرو۔ سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾﴾

''اور کھاؤ اور پیو البتہ اسراف نہ کرو' یقیناً اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اسی طرح حدیث میں بھی کھانے پینے میں اسراف سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھاؤ' پیو' صدقہ کرو اور پہنو' بشرطیکہ اس میں اسراف یا تکبر کی آمیزش نہ ہو۔'' (سنن ابن ماجہ)

کھانے کے آداب

کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا اور کُلّی کرنا: کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھونا اور کلی کرنا اور اسی طرح کھانے کے بعد ہاتھ دھونا اور کُلّی کرنا مستحب ہے۔ فرق ان میں یہ ہے کہ شروع میں ہاتھ دھو کر کسی تولیے وغیرہ سے صاف نہیں کرنے چاہئیں جبکہ کھانے کے بعد صاف کیے جاسکتے ہیں۔ حضرت سلمان فارسی ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونا باعث برکت ہے۔ مَیں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''کھانے سے پہلے اور اس کے بعد ہاتھ اور مُنہ کا دھونا (یعنی کُلّی کرنا) باعث برکت ہے۔''
(سنن ترمذی و سنن ابی داؤد)

کھانے کی ابتدا بسم اللہ سے کرنا: کھانا کھانے اور پانی پینے سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہیے' اس سے کھانے پینے کی اشیاء میں برکت ہوتی ہے اور شیطان کھانے میں شامل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کھانے کی بسم اللہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ۔ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی کھانے کا ارادہ کرے تو چاہیے کہ اللہ کا نام لے (یعنی بسم اللہ پڑھے) اور اگر شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو (یاد آنے پر) کہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَآخِرَهٗ''۔'' (سنن ترمذی و سنن ابی داؤد)

دوسری روایت میں فرمایا کہ جو بسم اللہ نہ پڑھے تو شیطان اس کے کھانے میں شریک ہوجاتا ہے اور کھانے کی برکت ختم ہوجاتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''شیطان اپنے لیے کھانے کو جائز کرلیتا ہے جب کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔''

کھانا دائیں ہاتھ سے اور سامنے سے کھانا: ہر اچھے کام کی ابتدا دائیں طرف سے کرنی چاہیے اور کھانے پینے کی چیزوں کے لیے بھی دایاں ہاتھ استعمال کرنا چاہیے۔ اسی طرح کھانے کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ اپنے سامنے سے کھانا کھایا جائے‘ اس لیے کہ سامنے سے چھوڑ کر درمیان یا کسی اور طرف سے کھانا اخلاق کے بھی خلاف ہے۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

”میں (بچپن میں) رسول اللہ ﷺ کی آغوشِ شفقت میں پرورش پا رہا تھا تو (کھانے کے وقت) میرا ہاتھ پلیٹ میں ہر طرف چلتا تھا‘ تو رسول اللہ ﷺ نے مجھے نصیحت فرمائی کہ (کھانے سے پہلے) بسم اللہ پڑھا کرو اور اپنے داہنے ہاتھ سے اور اپنے سامنے ہی سے کھایا کرو۔“ (متفق علیہ)

اسی طرح ایک دوسری روایت میں دائیں ہاتھ سے پینے کا بھی ذکر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تم میں سے کوئی کچھ کھائے تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور جب کچھ پیے تو داہنے ہاتھ سے پیے۔“ (صحیح مسلم)

کھانا زیادہ گرم نہ کھایا جائے: اسلام میں کھانے کو ٹھنڈا کر کے کھانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ گرم کھانے سے منہ جلنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ گرم کھانے میں تیزی اور جوش زیادہ ہوتا ہے جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

”ان کا یہ طریقہ تھا کہ جب ثرید پکا کر ان کے پاس لائی جاتی تو وہ ان کے حکم سے اس وقت تک ڈھکی رہتی کہ اس کی گرمی کا جوش اور تیزی ختم ہو جاتی (اس کے بعد وہ کھائی جاتی) اور وہ فرمایا کرتی تھیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ اس طرح (کچھ ٹھنڈا کر کے) کھانا زیادہ برکت کا باعث ہوتا ہے۔“ (مسند دارمی)

اجتماعی طور پر مل کر کھانے میں برکت ہے: اسلام چونکہ بھائی چارے کا مذہب ہے اور وہ اپنے ماننے والوں کو آپس میں اخوت کے رشتے کو فروغ دینے کی تعلیم دیتا ہے‘ اس لیے کھانے کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ لوگ مل کر کھانا کھائیں۔ اس سے کھانے میں برکت ہوگی اور آپس

میں پیار محبت میں اضافہ ہوگا۔ حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”نبی ﷺ کے بعض صحابہ نے عرض کیا کہ ہمارا حال یہ ہے کہ کھانا کھاتے ہیں اور آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔ آپ نے فرمایا: ”شاید تم الگ الگ کھاتے ہو؟“ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے ارشاد فرمایا: ”تم کھانے پر ایک ساتھ بیٹھا کرو اور بسم اللہ پڑھ کر (اجتماعی طور پر) کھایا کرو‘ اس سے تمہارے کھانے میں برکت ہوگی۔“ (سنن ابی داوٗد)

انگلیوں پر لگے کھانے کو چاٹنے کی ہدایت: ہمارے معاشرے میں لوگ کھانے کے بعد انگلیوں پر لگے کھانے کو چاٹنے کو اور برتن کو اچھی طرح صاف کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں‘ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کی ہدایت فرمائی ہے اور سائنس نے بھی اسے فائدہ کی چیز بتایا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اس طرح انگلیاں چاٹنے سے انسان معدے کے کینسر سے محفوظ رہتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی:

”(کھانے کے بعد) انگلیوں کو چاٹ لیا جائے اور برتن کو بھی صاف کر لیا جائے‘ اور آپ نے فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں کہ کھانے کے کس ذرّہ میں برکت ہے۔“ (مسلم)

سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت: اسلام نے تکبر کے ہر راستے کو بند کیا ہے۔ سونے چاندی کے برتن میں کھانے پینے سے چونکہ تکبر کا اندیشہ ہے اس لیے سونے چاندی کے برتن میں کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ سنن نسائی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

”رسول اللہ ﷺ نے سونے اور چاندی کے برتن میں کھانے سے منع فرمایا ہے۔“

ٹیک لگا کر متکبّرانہ انداز میں کھانے کی ممانعت: ایک طرف نبی کریم ﷺ نے تکبر کا دروازہ بند کرنے کے لیے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے منع کیا تو دوسری طرف بلاوجہ کسی چیز سے ٹیک لگا کر کھانے سے بھی منع کیا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ایسا کرنا متکبرین کا شیوہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک بکری ہدیہ کی گئی۔ آپ اکڑوں بیٹھ کر (دونوں زانوں کھڑے کر کے) کھانے لگے۔ ایک دیہاتی نے کہا: یہ بیٹھنے کا کیسا انداز ہے؟ آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے مجھے مہربان بندہ بنایا ہے نہ کہ تکبر و عناد کرنے والا مغرور۔“ (سنن ابن ماجہ)

دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”میں ٹیک لگا کر (یعنی کسی چیز کے سہارے بیٹھ کر) کھانا نہیں کھاتا۔“ (صحیح بخاری)

کھانے میں عیب نکالنے کی ممانعت: ہمارے معاشرے میں یہ بُرائی عام ہوتی جا رہی ہے اور گھروں میں بھی بچوں کی یہ عادت بنتی جا رہی ہے کہ وہ ناپسندیدگی کی بنا پر کھانے پینے کی چیزوں میں عیب نکالنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے کھانے پینے کی کسی چیز میں کبھی عیب نہیں نکالا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ فرماتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر مرغوب ہوا تو نوش فرما لیا اور نامرغوب ہوا تو چھوڑ دیا۔“ (متفق علیہ)

گرے ہوئے لقمے کو کھانے کی ہدایت: کھانے کھاتے وقت اگر کوئی لقمہ یا کھانے کی چیز کا کوئی ٹکڑا دسترخوان پر گر جائے تو اسے اُٹھا کر‘ صاف کر کے کھا لینا چاہیے‘ اس لیے کہ کسی کو نہیں پتا کہ کھانے کے کس جز میں برکت ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا کر نہ کھایا جائے تو اس سے رزق کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ حضرت جابر ؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا:

”تمہارے ہر کام کے وقت یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی شیطان تمہارے ساتھ رہتا ہے‘ لہٰذا (کھانا کھانے کے دوران) اگر کوئی لقمہ گر جائے تو اسے چاہیے کہ اس کو صاف کر کے کھا لے اور شیطان کے لیے نہ چھوڑے۔ پھر جب کھانے سے فارغ ہو تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لے‘ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کس کھانے (کے کس جزو) میں برکت ہے۔“ (صحیح مسلم)

البتہ اگر کوئی لقمہ زمین پر گر کر خاک آلود ہو گیا ہو یا ایسی جگہ گرا ہو کہ وہاں سے اٹھا کر کھانے کو انسان کا دل نہ چاہے تو پھر اس لقمہ کو اٹھا کر کھانے کے بجائے کسی صاف جگہ پر رکھ دینا چاہیے تاکہ رزق کی بے حرمتی نہ ہو۔

کھانے پینے کے بعد اللہ کا شکر ادا کرنا: ایک طرف کھانے پینے کے ابتدا میں بسم اللہ پڑھنے کا حکم ہے تو دوسری طرف کھانے پینے کے آخر میں اللہ کا شکر ادا کرنے کی بھی ہدایت ہے۔ حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو آپ فرماتے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَا وَ جَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ ”ساری حمد و ستائش اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا‘ پلایا اور مسلمان بنایا۔“ (سنن ترمذی و سنن ابی داؤد)

کھانے کے چند متفرق آداب

ان آداب کے علاوہ بھی علماء نے کھانے پینے کے چند اور آداب بیان کیے ہیں جو ذیل میں بیان کیے جاتے ہیں:

① روٹی سے انگلیاں صاف نہ کریں۔ یہ ایک گھناؤنی اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے۔

② نوالہ درمیانہ ہو جس کا کھانا آپ کے لیے آسان ہو اور ایک نوالہ ختم ہونے کے بعد دوسرا نوالہ توڑیں۔

③ اجتماعی کھانے میں زیادہ کھانے اور آہستہ کھانے والا کا ساتھ دیں اور لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہیں۔

④ کھانے کے دوران منہ میں انگلی ڈال کر دانتوں میں پھنسے کھانے کو نہ نکالیں۔ اس سے باقی لوگوں کو ناگواری ہوتی ہے۔

⑤ کھانے کو بلاضرورت نہ سونگھیں‘ اس سے بھی دوسرے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

⑥ کھانے کے دوران قہقہہ مار کر ہنسنے اور بلاضرورت باتیں کرنے سے پرہیز کریں۔

پینے کے آداب

کھانے کے آداب میں بھی پینے کے بعض آداب کا تذکرہ آ گیا‘ مثلاً پینے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا اور بعد میں اللہ کا شکر ادا کرنا‘ دائیں ہاتھ سے پینا‘ سونے چاندی کے برتن میں نہ پینا اور پینے کی کسی چیز میں عیب نہ نکالنا۔ اس کے علاوہ بھی پینے کی چند آداب ہیں جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جا رہا ہے۔

ایک سانس میں پینے کی ممانعت: پانی کے بارے میں یہ ہدایت ہے کہ پانی ایک سانس میں نہیں بلکہ تین سانسوں میں پیا جائے۔ اس کی وجہ یہ کہ ایک سانس میں پینے سے انسان کی پیاس ختم نہیں ہوتی اور اگر تین سانسوں میں پیا جائے تو یہ انسان کی صحت اور سیرابی کے لیے فائدہ مند

ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے‘ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’تم اونٹ کی طرح ایک سانس میں نہ پیا کرو‘ بلکہ دو یا تین سانسوں میں پیا کرو اور جب پینے لگو تو بسم اللہ پڑھو اور جب پی چکو اور برتن منہ سے ہٹاؤ تو اللہ کا شکر کرو۔‘‘ (سنن ترمذی)

ایک دوسری رویت میں رسول اللہ ﷺ کے پانی پینے کے طریقے کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ کے خادم حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’رسول اللہ ﷺ پینے میں تین دفعہ سانس لیتے تھے۔‘‘ (صحیح بخاری)

برتن میں سانس لینے کی ممانعت: لوگوں میں یہ چیز عام ہوتی جا رہی ہے کہ پانی پیتے وقت جب سانس لینے کے لیے رکتے ہیں تو گلاس کو منہ سے ہٹائے بغیر سانس لیتے ہیں‘ حالانکہ ایسا کرنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ دوسرے آدمی کو اس گلاس میں پینے سے کوفت ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

’’رسول اللہ ﷺ نے پینے کے برتن میں سانس لینے یا پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘ (سنن ابی داؤد و سنن ابن ماجہ)

کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت: اپنے آپ کو تہذیب یافتہ کہنے والوں میں کھڑے ہو کر پینے کی عادت پائی جاتی ہے اور وہ بیٹھ کر پینے کو تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں‘ حالانکہ بیٹھ کر پینا سُنّت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا۔ (متفق علیہ)

نبی کریم ﷺ کے پسندیدہ کھانے

کھانے پینے کے آداب بیان کرنے کے بعد اب ان اشیاء کو بیان کیا جا رہا ہے جو نبی کریم ﷺ کو پسند تھیں اور آپؐ ان کو کثرت اور شوق سے تناول فرمایا کرتے تھے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان چیزوں کو نبی کریم ﷺ کی پسندیدگی کی بنا پر زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔

① کدو (لوکی)

’’حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک درزی نے رسول اللہ ﷺ کو کھانے پر مدعو کیا تو میں بھی آپؐ کے ساتھ چلا گیا۔ اُس نے جو کی روٹی اور شوربا حاضر کیا جس میں لوکی

کے قتلے اور سکھائے ہوئے گوشت کی بوٹیاں تھیں۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ لوکی کے قتلے پیالے کی اطراف سے چن چن کر تناول فرما رہے تھے۔ تو اس دن سے لوکی مجھے بھی مرغوب اور محبوب ہو گئی۔‘‘ (متفق علیہ)

② ثرید

’’حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو روٹی (اور گوشت کے شوربے) سے بنی ہوئی ثرید اور میدہ والی (یعنی روٹی‘ کھجور اور گھی والی) ثرید زیادہ مرغوب تھی۔‘‘ (سنن ابی داؤد)

③ کھجور اور کھیرا

’’حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کچی تر کھجوریں کھیرے کے ساتھ تناول فرماتے ہوئے دیکھا۔‘‘ (متفق علیہ)

④ خربوزہ

’’حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ خربوزہ اور کچی تر کھجوریں ایک ساتھ کھاتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کھجوروں کی گرمی کا توڑ اس خربوزہ کی ٹھنڈک سے ہو جاتا ہے اور خربوزہ کی ٹھنڈک کا توڑ کھجوروں کی گرمی سے ہو جاتا ہے۔‘‘ (سنن ابی داؤد)

⑤ شہد اور میٹھی اشیاء

’’حضرت عائشہ صِدّیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ میٹھی اشیاء اور شہد پسند فرماتے تھے۔‘‘ (صحیح مسلم)

اس کے علاوہ نبی کریم ﷺ کو بکری کا دستی کا گوشت اور سرکہ بھی پسند تھا۔ پینے میں ٹھنڈا پانی اور دودھ‘ کھجور اور انگور کا شربت پسند تھا۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان آداب کی رعایت رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے اس مادی عمل کو بھی ثواب اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین! ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مسلم سائنس دان: موساد کا خصوصی ہدف

رضی الدین سید☆

وکٹر آسٹرووِسکی موساد کا ایک سابقہ ایجنٹ ہے جس نے اپنے ضمیر کے کچوکوں سے تنگ آ کر بالآخر ملازمت سے استعفا دے دیا تھا اور بعد ازاں اپنے تجربات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب "By Way of Deception" لکھی تھی۔ کتاب میں اس نے موساد کے تمام طریقہ ہائے کار اور ۱۹۸۹ء تک کی جانے والی تمام کارروائیوں کی تفصیلی اور ہوش رُبا وضاحتیں کی ہیں۔ اسی ضمن میں اُس نے عراق کے ایک ایٹمی سائنس دان کے موساد کے چنگل میں پھنسنے اور پھر اس کا شکار ہو جانے کی روداد بھی بیان کی ہے‘ جس کا وہ خود گواہ بھی تھا۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اسی داستان کے جستہ جستہ حقائق ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہماری حکومتیں اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے فریفتہ ہوتی جا رہی ہیں‘ لیکن انہیں معلوم نہیں ہے کہ اگر ملک میں اسرائیلی سفارت خانے کھل گئے تو پاکستان کو دنیا کے نقشے سے غائب کر دینا موساد کے لیے کس قدر آسان ہو جائے گا! اسرائیلی موساد کی ذہانت اور طاقت کے آگے تو امریکی سی آئی اے بھی پانی بھرتی ہے۔

۸۲-۱۹۸۰ء کے دوران ایک عراقی ایٹمی سائنس دان ’’بطرس بن حلیم‘‘ اور اس کی بیوی کو حکومت کی جانب سے فرانس روانہ کیا گیا تا کہ وہ وہاں ایٹمی آلات کی خریداری کر سکیں۔ پیرس کے ایک بڑے ہوٹل میں اس جوڑے نے رہائش اختیار کی۔ تاہم موساد کے ایجنٹوں کو ان کے بارے میں پہلے ہی آگاہی ہو چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے ان سے متعلق تمام معلومات حاصل کیں اور اپنی مہارت سے ان کے کمرے میں خفیہ آلات نصب کر دیے۔ نیز ایک حسین یہودی عورت کو معاوضے پر حاصل کر کے اسے ہوٹل روانہ کیا‘ جس نے سائنس دان کی بیوی سے ایک ملاقات کی۔ یہ ملاقات اس نے تب کی جب وہ ہوٹل میں اکیلی تھی اور اُس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا۔

☆ national.a.research@gmail.com

پرفیوم فروش کی حیثیت سے خود کو پیش کرتے ہوئے اس نے سائنس دان کی بیوی سے خوب دوستی کر لی اور اس کے شوہر اور ہوٹل کی تمام معلومات بھی حاصل کر لیں۔ دورانِ گفتگو بیگم نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ اپنی ماں کی بیماری کے باعث وہ کچھ عرصے کے لیے بطرس کو یہاں تنہا چھوڑ کر واپس عراق جا رہی ہے۔ ایک آدھ دن کے وقفے سے مذکورہ یہودن ’’جیکولن‘‘ اس کے لیے ایک خوبصورت ’’کی چین‘‘ تحفتاً لے کر آئی اور اسے یہ کہہ کر پیش کیا کہ لاؤ کمرے کے چابی مجھے دو‘ میں یہ چابی خود ہی کی چین میں ڈال دوں گی۔ اس طرح اس نے خفیہ طور پر ہوٹل کے کمرے کی چابی کی نقل بھی تیار کر لی۔ بعد میں بطرس کے ہمدرد دوست کی شکل میں موساد کا ایک ایجنٹ اُسے ملا جسے پتہ تھا کہ روپیہ‘ عورت‘ اور ہمدردی کسی بھی شخص سے کچھ حاصل کروانے کے لیے کافی ہے۔ چنانچہ بیوی کی غیر موجودگی میں اس نے بطرس کے لیے ایک خوبصورت لڑکی بھیجی اور کہا: ’’میرے دوست مزے اڑاؤ۔‘‘ ایجنٹ نے مزید قابو کرنے کے لیے اس سے یہ بھی کہا کہ وہ ایک ’’نامیاتی‘‘ (Pneumatic) انجینئرنگ کاروباری ہے اور جرمنی سے اسے ایک خوبصورت آرڈر ملا ہے‘ تاہم اس سودے میں اُسے دھوکے کا بھی خدشہ ہے۔ دوستی گہری ہو جانے کی بنیاد پر بطرس نے اسے فوراً اپنا تعاون پیش کیا۔ کیس مضبوط کرنے کے لیے ایجنٹ نے اس سے فوراً سوال کیا: ’’لیکن ان نامیاتی ٹیوبس کو تو کوئی سائنس دان ہی پرکھ سکتا ہے؟‘‘۔ ’’میں بھی تو ایک سائنس دان ہی ہوں!‘‘ بطرس نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ ’’لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ تم ایک طالب علم ہو!‘‘۔ ’’ہاں! دراصل میں عراق سے ایک خصوصی مشن پر یہاں آیا ہوں۔‘‘ (ایجنٹ کے لیے معاملہ مزید آسان ہو گیا!) ’’اچھا تو سودے کی کامیابی کے عوض میں تمہیں ایک معقول رقم فراہم کروں گا۔‘‘ اس طرح بطرس کے لیے دولت‘ جنس اور ہمدردی‘ تینوں ہی معاملات ایک ساتھ حل ہو گئے۔

بعد میں بطرس کے کمرے میں طوائفوں کا آنا جانا مسلسل لگا رہا جس کے ساتھ ایک بھاری رقم بھی اسے فراہم کر دی گئی۔ ربیوں نے یہ بات طے کر دی ہے کہ اگر کوئی لڑکی وطن (اسرائیل) کی خاطر اپنے آپ کو ہدف شدہ شخص کے آگے پیش کر دے تو یہ بات اُس کے لیے ایک بڑی نیکی کی حیثیت رکھے گی۔ کچھ دنوں کے بعد بطرس کو محسوس ہونے لگا کہ اُس کے دوستوں نے شاید اسے ’’پھانسنے‘‘ کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اُس نے بیوی کو تمام حالات سے آگاہ کیا۔ بیوی نے بے ساختہ کہا کہ ’’مجھے تو وہ موساد کا آدمی لگتا ہے۔‘‘

پیرس میں دوسرے سائنس دان یحییٰ المیشاد کے آنے کے بعد موساد نے اسے بھی گھیرنے کی کوشش کی۔ بدقسمتی سے یحییٰ خود بھی لڑکیوں کا دلدادہ نکلا۔ چنانچہ دو تین یہودی لڑکیاں اس کا دل بہلانے ہر روز اس کے کمرے میں ضرور موجود ہوتی تھیں جو دراصل موساد کے ہاتھوں کا کھلونا تھیں۔

ایک دن جبکہ عراق کے لیے ''میراج طیاروں'' کی ڈیل مکمل ہونے والی تھی' موساد نے سادہ کپڑوں میں مذکورہ پلانٹ کے پاس چند دہشت گردوں کو چھپا دیا۔ یحییٰ بھی جہازوں کی ترسیل کے لیے موقع پر موجود تھا۔ سکیورٹی بہت سخت تھی اور محافظین بھی چوکس تھے' لیکن حقیقت یہ تھی کہ یہودی دہشت گردوں نے پانچ مقامات پر دھماکہ خیز مواد پہلے ہی سے رکھ دیا تھا۔ اسی دوران ایک حسین راہ گیر لڑکی (جو گماشتۂ موساد تھی) کا ایک گزرتی ہوئی کار کے ساتھ اچانک ٹکراؤ ہو گیا۔ پھر وہاں آناً فاناً چیخ وپکار شروع ہو گئی۔ محافظین دم بخود رہ گئے اور جائے وقوعہ کی جانب دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں مجمع اکٹھا ہو گیا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اچانک جگہ جگہ دھماکے بھی شروع ہو گئے۔ محافظین بھی بھاگنے لگے اور حادثے والی کار اور لڑکی بھی فرار ہو گئے۔ دراصل کار کا یہ حادثہ اور وہ لڑکی سب کچھ طے شدہ معاملات تھے۔ پتہ لگا کہ اسی افراتفری میں تمام میراج طیارے تباہ کر دیے گئے ہیں!

عراق کے مطلوبہ جہاز تو موساد نے تباہ کر دیے تھے' لیکن یحییٰ المیشاد سے نمٹنا ابھی باقی تھا۔ یحییٰ کو بھی اگرچہ خطرے کا احساس ہو گیا تھا' لیکن اس نے بیوی سے کہا تھا کہ ''اپنی جان کی بازی لگا کر بھی میں ایٹم بم ضرور بناؤں گا''۔ بطرس کی طرح یحییٰ بھی لڑکیوں کا دلدادہ تھا۔ موساد نے ایک کال گرل کو اس کے لیے بطورِ خاص وقف کیا ہوا تھا جسے بھاری مشاہرہ بھی دیا جا رہا تھا۔

موساد کے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ یحییٰ بھی اگر بطرس کی مانند اس کے لیے کام کرنے لگے تو اس پر انعامات کی برسات کر دی جائے' بھاگ بصورتِ دیگر اسے راستے سے ہٹا دیا جائے۔ چنانچہ ایک رات اس کے کمرے کا دروازہ اچانک کھٹکھٹایا گیا۔ ''تم کون ہو؟'' دروازہ کھولتے ہوئے یحییٰ نے سوال کیا۔ ''مجھے ایک ایسی قوت نے یہاں بھیجا ہے جس کے سوالوں کے جواب پر تمہیں ایک بھاری رقم انعام کے طور پر پیش کی جائے گی''۔ ''بھاگ جاؤ تم ذلیل آدمی''۔ یحییٰ نے دروازہ بند کرتے ہوئے زور سے کہا: ''میں پولیس کو بلالوں گا''۔ بعد ازاں مذکورہ طوائف دو گھنٹے تک مزید اس کے کمرے میں رہی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی

کمرے سے یحییٰ المیشاد کی خون میں تر بتر لاش ملی۔ خبر سن کر طوائف دھچکے میں رہ گئی۔ حیرت انگیز طور پر کمرے سے کوئی ایک چیز بھی نہیں چرائی گئی تھی۔ یحییٰ کے بعد موساد نے فیصلہ کیا کہ اس کال گرل کو بھی اب ٹھکانے لگا دیا جائے' کیونکہ بہت سارے حقائق وہ بھی پولیس کو بتا سکتی تھی۔ چنانچہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ایک متمول شخص نے بے حد معقول ''خدمتی'' معاوضے کے تحت اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور پھر ایک سنسان جگہ سے لڑکی کی گردن کٹی لاش ملی۔ اس طرح موساد نے ایٹمی سائنس دان اور اس کی داشتہ دونوں کو آرام سے ٹھکانے لگا دیا۔

عراق کے ایٹمی سائنس دان کی یہ کہانی اگرچہ یہاں اختتام پذیر ہوتی ہے' لیکن بہت سارے اہم حقائق بھی ہمارے آگے کھول کے رکھتی ہے:

(۱) موساد دنیا کے کسی بھی ملک میں اپنی دہشت گردانہ کارروائیاں کر سکتی ہے۔ چند سال قبل ہی اس نے دبئی کے ایک ہوٹل میں حماس کے پانچ لیڈروں کو بھی پُراسرار طور پر شہید کر دیا تھا۔

(۲) ستمبر ۲۰۱۹ء کے اوائل میں ایک مصری سائنس دان کا بھی پُراسرار قتل ہوا تھا۔ ابوبکر رمضان نامی یہ ایٹمی سائنس دان مراکش میں کسی سیمینار میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے اور انہوں نے وہاں مذاکرے میں باقاعدہ شرکت بھی کی تھی۔ لیکن وقفے میں جب وہ ہوٹل کے اسٹال سے چائے وغیرہ پینے گئے تو فوراً ہی ان کی طبیعت خراب ہوئی اور وہ فوراً اپنے کمرے میں لوٹ آئے۔ انہیں طبّی امداد کے لیے ہسپتال بھی لے جایا گیا لیکن راستے ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ایک پُراسرار موت تھی جس کے بارے میں موساد پر شبہ کیا جا رہا ہے۔

(۳) ہو سکتا ہے کہ پاکستانی نامور سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر بھی موساد نے اپنے حربے آزمانے کی کوشش کی ہو' لیکن اسلام کے ساتھ ان کی عملی وابستگی' قرآن سے ان کا غیر منقطع تعلق اور یہودی چالوں سے ان کی گہری واقفیت نے انہیں محفوظ رکھا ہو گا' جو اُن پر' اہل پاکستان پر' اور خود وطن عزیز پاکستان پر اللہ تعالیٰ کا ایک خصوصی فضل وانعام ہے۔

دیگر مسلم سائنس دانوں کے قتل

ذیل میں ایک فہرست ان دیگر مسلم سائنس دانوں کی دی جا رہی ہے جنہیں گزشتہ عشروں کے دوران قتل کیا گیا۔

(۱) ڈاکٹر سمیرہ موسیٰ خاتون: مصری ایٹمی سائنس دان جنہیں ایک نامعلوم ڈرائیور نے ۱۹۵۲ء

میں سڑک کے ایک حادثے میں ہلاک کر دیا تھا۔

(۲) سمیر نقیب: مصری ایٹمی سائنس دان جو ۱۹۶۷ء میں امریکہ میں ایک کار حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

(۳) ڈاکٹر یحییٰ امین المساعد: مصری سائنس دان اور عراق نیوکلیائی پروجیکٹ کے سربراہ جنہیں ۱۹۸۰ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔

(۴) ڈاکٹر علی مصطفیٰ مشرف پاشا: مصر کے اطلاقی ریاضی (Applied Mathematics) کے پروفیسر جنہیں ۱۹۵۰ء میں قتل کیا گیا تھا۔

(۵) ڈاکٹر سلویٰ حبیب: گمان کیا جاتا ہے کہ موساد نے انہیں ان کی چشم کشا کتاب Israeli Influence In Africa کی اشاعت کے جرم میں قتل کیا تھا۔

(۶) ڈاکٹر جمال ہمدان: مصری سائنس دان‘ مصنف اور ادیب‘ جو اپنے گھر میں ۱۹۹۳ء میں مُردہ حالت میں جلے ہوئے پائے گئے تھے۔ ان کی کتاب کا مسودہ بھی ان کے ساتھ پایا گیا تھا۔

(۷) ڈاکٹر حسن کامل الصباح: لبنانی ماہر طبیعیات جنہیں ۱۹۳۵ء میں قتل کیا گیا تھا۔

(۸) ڈاکٹر رمّال حسن رمّال: لبنانی ماہر طبیعیات جنہیں ”عربوں کا ایڈیسن“ گردانا اور اپنے دور کے ”سو بڑے عالمی ماہرین طبیعیات“ میں شمار کیا جاتا تھا‘ موساد نے انہیں ۱۹۹۱ء میں قتل کر دیا تھا۔

(۹) ڈاکٹر اردشیر حسن پور: ایرانی نیوکلیائی سائنس دان جنہیں موساد نے ۲۰۰۷ء میں قتل کیا تھا۔

(۱۰) محسن فخری زادہ: ایرانی ایٹمی سائنس دان جنہیں موساد نے نومبر ۲۰۱۹ء میں تہران کے پاس ایک بھاری گن سے قتل کیا تھا۔ وہ ایران کے بابائے ایٹمی ٹیکنالوجی کہلاتے تھے۔

(۱۱) ڈاکٹر ماجد شہریاری: ایرانی نیوکلیائی سائنس دان جنہیں ۲۰۱۰ء میں موساد نے قتل کیا تھا۔

(۱۲) ڈاکٹر فریدون عباسی: ایرانی نیوکلیائی سائنس دان جنہیں موساد نے ڈاکٹر ماجد شہریاری کے ساتھ قتل کرنے کی کوشش کی تھی‘ لیکن وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

(۱۳) درویش رضائی: الیکٹرونک سائنس دان جو ایرانی وزارتِ دفاع میں کام کرتے تھے۔ انہی

کے گن مین نے انہیں ۲۴ جولائی ۲۰۱۱ء کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔

(۱۴) مسعود علی محمدی: ایرانی ایلیمنٹری فزیسسٹ جنہیں ۲۰۱۰ء میں تہران میں ان کے گھر کے باہر ہی قتل کر دیا گیا تھا۔

(۱۵) محمد الزواری: تیونسی فضائی انجینئر جنہیں ۲۰۱۶ء میں ان کے گھر کے پاس ہی قتل کر دیا گیا تھا۔

(۱۶) ابراہیم الظاہری: عراقی ایٹمی سائنس دان جنہیں ۲۰۰۴ء میں بوبک (عراق) میں ایک ٹیکسی میں سواری کے دوران قتل کیا گیا تھا۔

(۱۷) عزیز اصبار: شامی ”گائیڈڈ میزائل“ سائنس دان جو اسرائیلی شہروں کو تباہ کرنے والے میزائلوں کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ شامی و ایرانی حکومتوں کے اعلیٰ حلقوں میں انہیں آزادانہ رسائی حاصل تھی۔ وہ اپنی ہی کار میں موساد کے نصب کردہ بم سے اچانک ہلاک ہو گئے تھے۔ میزائل کی پرواز میں مائع تیل کی جگہ ٹھوس ایندھن کی تیاری اور دور مار میزائیلوں میں تبدیلی بھی ان کی تحقیق میں شامل تھی۔

(۱۸) پروفیسر فادی محمد البطش: ملائشیا میں راکٹ سازی سے منسلک اس فلسطینی سائنس دان کو دو نامعلوم مسلح افراد نے نماز فجر کی ادائیگی کے بعد راستے میں گولی مار کر شہید کر دیا۔ یہ واقعہ ملائشیا کے شہر کوالالمپور میں پیش آیا۔ ملائشیا کے نائب وزیر اعظم نے ملزموں کا تعلق غیر ملکی خفیہ ایجنسی سے بتایا‘ جبکہ مقتول کے اہل خانہ نے موساد کو اس سانحے کا ذمے دار ٹھہرایا۔

مندرجہ بالا معلومات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تمام مسلم ممالک اپنی اپنی جگہ ایٹمی طاقت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ تمام حقائق کینیڈا سے شائع ہونے والے ماہنامے "The Crescent International" کے اگست ۲۰۱۱ء‘ نیویارک ٹائمز کے اگست ۲۰۱۸ء کے شماروں‘ اور گوگل سرچ ”مسلم سائنس دانوں کے قتل“ کی مدد سے پیش کیے گئے ہیں۔ اسرائیلی ایجنسی موساد کسی بھی مسلم سائنس دان کو زندہ نہیں رہنے دینا چاہتی۔ اپنے ملک کی بربادی کا اسے مسلسل خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

علمِ تفسیر اور مفسّرین کرام

پروفیسر حافظ قاسم رضوان

لفظ تفسیر باب تفعیل کے مصدر فسر سے ماخوذ و مشتق ہے اور اس کے معنی بیان‘ وضاحت اور تشریح کے ہیں۔ تاویل‘ اول سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی رجوع کے ہیں‘ گویا مقدرہ اور محتملہ معنی میں سے کسی ایک کی طرف رجوع کرنا۔ امام جلال الدین سیوطی نے تفسیر و تاویل کے معنی اور باہمی فرق کو واضح کرنے کے لیے کچھ ائمہ مفسّرین کے اقوال ’’الاتقان‘‘ میں نقل فرمائے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ تفسیر‘ تاویل سے عام ہے۔ تفسیر کا اکثر استعمال الفاظ و مفردات میں ہوتا ہے‘ جبکہ تاویل اکثر معانی اور جملوں میں استعمال ہوتی ہے۔ علامہ اصفہانی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ علماء کی اصطلاح میں تفسیر قرآن کریم کے معانی اور اس کی مراد بیان کرنے اور واضح کرنے کو کہتے ہیں‘ خواہ باعتبارِ حلِ الفاظِ مشکلہ ہو یا غیر مشکلہ‘ یا باعتبارِ معنی ظاہری ہو یا خفی‘ اور تاویل کلامِ تام اور جملوں کا مفہوم متعین کرنے کو کہتے ہیں۔ بعض ائمہ کا ارشاد ہے کہ تفسیر کا تعلق روایت سے اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے۔

امام ابونصر القشیری بیان کرتے ہیں کہ تفسیر سماع اور اتباعِ رسول اللہﷺ پر موقوف ہے اور تاویل اجتہاد و استنباط کا نام ہے۔ کتاب اللہ کا جو مفہوم سُنّتِ رسولؐ اور احادیثِ صحیحہ سے متعین ہے وہ تفسیر کہلائے گی اور اس معیّن‘ واضح مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے موافق جو نکاتِ معارف راسخ علماء اور محققین استنباط کریں گے‘ وہ تاویل کہلائیں گے۔ امام ماتریدی کا قول ہے کہ تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ کلام اللہ کے ایک معنی پر پورا یقین کر لینا کہ مرادِ الٰہی بس یہی ہے اور تاویل یہ ہے کہ معانی کے چند احتمالات میں سے کسی ایک کو اختیار کر لینا۔

اب تفسیر اسلامی شریعت کا ایک اصطلاحی عنوان ہے‘ صرف از روئے عربیت (عربی لغت و نحو) آیاتِ قرآنی کا ترجمہ یا ان کا اجمالی مفہوم بیان کر دینا یا سمجھ لینا ہی تفسیر نہیں ہے۔ اس کا اصل

مفہوم نزولِ آیات و زمانِ نزول‘ احوالِ نزول‘ واقعاتِ متعلقہ‘ اسبابِ نزولِ آیاتِ قرآنی‘ ان کا مکّی یا مدنی ہونا‘ محکم یا متشابہ ہونا‘ ناسخ و منسوخ ہونا‘ خاص و عام ہونا‘ مطلق و مقید ہونا‘ مجمل و مفصل ہونا اور ان میں احکامِ حلال و حرام‘ وعدہ وعید‘ امثال و عبر پر مشتمل ہونا‘ اور یہ کہ دلالتِ آیات فرضیت پر ہے یا وجوب و استحباب پر۔ ان سب امور کو جانتے ہوئے جو بات قرآن مجید کی تشریح اور وضاحت میں کہی جائے گی‘ وہی تفسیر کہلائے گی۔ اور اگر ان سب کے بغیر کوئی بات قرآن پاک کی توضیح میں منہ سے نکلے گی تو اسے قیاس آرائی اور تفسیر بالرائے کہا جائے گا‘ جس کی ممانعت میں ارشادِ رسولﷺ ہے: ((مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْیِہٖ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ)) (رواہ الترمذی) ’’جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے (خیال) سے کی تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانہ بنا لے‘‘۔

اب گویا جو بیان قرآن مجید کے ظاہر کے مطابق اور قطعی ہو‘ وہ تفسیر ہے‘ خواہ کلام معصوم سے ہو یا غیر معصوم سے۔ اور جو بیان خلافِ ظاہر مگر قواعد اور قرائن سیاق و سباق کے مطابق ہو تو تاویل ہے۔ یہ اگر معصوم کی طرف سے ہے تو قطعی ہے اور غیر معصوم کی طرف سے ہونے کی صورت میں ظنی کہلائے گا۔ حضرت یوسفؑ کے بارے میں ارشادِ قرآنی ہے: ﴿وَیُعَلِّمُکَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ﴾ (یوسف:6)۔ یہاں تاویل ظنی نہیں بلکہ قطعی ہو گی‘ کیونکہ سکھانے والا اللہ ہے اور جس کو سکھایا جا رہا ہے‘ وہ اُس کا پیغمبر ہے۔ اسی طرح حضرت خضرؑ خدا تعالیٰ کی طرف سے بتائے ہوئے اُمورِ تکوینیہ کو اسی عنوان سے تعبیر فرماتے ہیں: ﴿ذٰلِکَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْہِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾﴾ (الکہف)۔ یہاں بھی تاویل قطعیت ہی کی شان کے ساتھ متصف ہے اور وہ اللہ کے حکم اور اجازت سے ہی سب کچھ بتا رہے ہیں۔ غرضیکہ تاویل کا عنوان صرف ظن اور احتمال کے لیے مخصوص نہیں بلکہ اس کی اضافت دیکھی جائے گی کہ وہ کس معنی پر مبنی ہے۔ اگر تاویل کی اضافت اللہ تعالیٰ یا اُس کے نبی اور رسول کی طرف ہے تو وہ قطعی اور یقینی ہے۔ اور اگر یہ اصول و قواعد مقررہ کے تحت کسی ایسے معنی کا استنباط ہے جو حدیث مرفوع یا صحابہ کرامؓ کی تفسیر میں اگرچہ منصوص نہیں‘ لیکن انہی کے مقرر کردہ اصول و ضوابط سے وہ معنی ماخوذ ہیں تو پھر یہ تاویل ظنی ہے۔ جیسے ائمہ مجتہدین اور فقہاءِ کرام کے اصول اور کتاب و سُنّت سے استنباط کردہ فقہی فروع و جزئیات‘ یہ سب ظنی کہلاتی ہیں‘ اس طور پر کہ وہ امر جزئی اور مسئلہ فقہی بعینہٖ اس طرح قطعی اور یقینی نہیں جس طرح کہ قرآن کا ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ کا حکم ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سورۃ القیامہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ 'تفسیر' میں تین رعایتیں شرط ہیں: (ا) ہر کلمہ کو معنی حقیقی یا مجاز متعارف پر محمول کرنا (ب) سیاق و سباق کو ملحوظ رکھنا کہ کلام بے ربط نہ ہو جائے (ج) شاہدانِ نزولِ وحی یعنی حضورِ اَقدس ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی تشریح اس کے خلاف نہ ہو۔ پس اگر شرطِ اوّل مدِنظر نہ رہے تو تاویل قریب ہے' شرط دوم اور سوم مدِنظر نہ ہو تو تاویل بعید' اور اگر تینوں شرائط سامنے نہ رہیں تو پھر تحریف ہوگی۔ اسی لیے اصولِ تفسیر کی کتابوں میں تفسیر کی تعریف یوں ہوتی ہے:

ان علم التفسير علم يبحث فيه عن معنى نظم القرآن بحسب القوانين العربية والقواعد والشرعية بقدر الطاقة البشرية

''علمِ تفسیر اس علم کو کہا جاتا ہے جس میں نظم قرآنی کے معنی سے بحث کی جائے' قوانینِ عربیہ اور قواعدِ شرعیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے انسانی استطاعت کے مطابق۔''

امام سیوطیؒ ابن النقیب سے نقل کرتے ہیں کہ علومِ قرآنی کی تین اقسام ہیں:

(ا) کتاب اللہ کے وہ اَسرار جن کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو مطلع نہیں فرمایا اور انہیں اپنے علم کے ساتھ ہی مختص رکھا' جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اُس کے غیب کی اصل حقیقت۔ سو ان امور پر غور وخوض اور تحقیق کسی کے لیے بھی درست نہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ﴾ (الانعام:۱۰۳) ''انسانی نگاہیں (اور افکار) اُس ذاتِ حق کا ادراک نہیں کر سکتیں۔''

(ب) کتاب اللہ کے وہ اَسرار جن پر ذاتِ باری تعالیٰ نے صرف خاتم النّبیین ﷺ کو مطلع فرمایا۔ ان پر کلام صرف نبی کریم ﷺ ہی کر سکتے ہیں' جیسے قرآن شریف کے حروفِ مقطعات (الٓمّٓ' حٰمٓ' نٓ وغیرہ) کے حقیقی معنی۔

(ج) وہ تمام علوم جو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لیے نبی کریم ﷺ کو سکھائے۔ ان علوم میں بعض تو نقل اور روایت پر موقوف ہیں' جیسے اسبابِ نزول اور ناسخ و منسوخ کی معرفت' حشر و نشر' جزا و سزا' جنّت و جہنّم اور تمام اعتقادی اور تعبدی احکام۔ یہ سب رسول اللہ ﷺ سے جس طرح ثابت اور منقول ہیں' ان پر اسی طرح یقین کرنا لازم ہے۔ اور بعض امور وہ ہیں جو روایت اور نقل پر مبنی نہیں' جیسے وہ تمام دلائل جو نظر و فکر سے تعلق رکھتے

ہیں اور حق تعالیٰ کی خالقیت' اُس کی توحید و ربوبیت پر دلائل و براہین وغیرہ۔ اسی پر خدائے بزرگ و برتر نے نظر و فکر کی دعوت دی اور اسی واسطے دلائل قدرت کا ذکر فرمایا تاکہ ان کے ذریعے معرفت ربوبیت حاصل ہو۔ گویا اَحکام و اصولِ دین میں اتباعِ سُنّت کو ضروری قرار دیا گیا اور دلائل قدرت میں اہلِ علم کو نظر و فکر کی دعوت دی گئی۔

اصولِ تفسیر کے فہم سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مراتب تفسیر پانچ اقسام میں مقید ہیں۔ قسم اول کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے ہی کی جائے: 'القرآن يفسر بعضه بعضا'۔ قرآن حکیم میں بعض احکام و واقعات کا ذکر مکرر ہوتا ہے' کسی مقام پر کوئی بات اگر مجمل بیان ہوئی ہے تو دوسرے موقع پر کتاب اللہ میں مفصل طور پر اس کا ذکر ہے۔ اس طرح سے اجمالی آیات کی تفسیر واضح اور تفصیلی آیات سے ممکن ہے' جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن کریم میں کئی جگہ مجمل اور مفصل مذکور ہے جب تک تمام آیات پر نظر نہ ہو' اس کا صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ قسم دوم کہ قرآن مجید کی تفسیر سُنّتِ نبوی اور حدیثِ مبارک کی مدد سے کی جائے' کیونکہ اصلاً کلام اللہ کی حقیقی شارع نبی کریم ﷺ کی ذات اور اس کی کامل تفسیر سُنّتِ رسول ہے۔ آپؐ کی پوری سیرتِ طیبہ قرآن کریم کی ہی عملی تشریح ہے۔ قرآن نے خود اس بات کو واضح کر دیا: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے نازل کیا آپ (ﷺ) کی طرف ذکر (قرآن) تاکہ آپؐ واضح کریں لوگوں کے لیے وہ کلام جو ان کے لیے اُتارا گیا''۔ حضرت عائشہ ؓ سے نبی کریم ﷺ کی عملی زندگی اور اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو جواب میں آپ ؓ نے فرمایا: ((كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ)) ''آپؐ کی حیات اور اخلاق عین قرآن ہیں''۔ امام جلال الدین سیوطیؒ نے ''الاتقان'' میں امام شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ كل ما حكم رسول الله ﷺ فهو مِمّا فهم من القرآن ''جو کوئی بھی فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے صادر فرمایا' وہ بس وہی ہے جو کہ آپؐ نے قرآن سے سمجھا''۔ قسم سوم کہ قرآن کریم کی تفسیر صحابہ کرام ؓ کی تشریح اور توضیح کی مدد سے کی جائے۔ اگر کسی آیت کی وضاحت میں حدیث مرفوع نہ ہو تو پھر آثارِ صحابہ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ یہی نفوسِ قدسیہ قرآن مجید کے سب سے پہلے مخاطب ہیں۔ انہی کے سامنے وحی اترتی اور زبانِ رسالتؐ سے اس کی وضاحت انہی کے کان سنتے۔ ان کے قلوب انوارِ نبوت سے منور اور طہارت و پاکیزگی سے متصف تھے۔ ملّتِ اسلامیہ

میں صحابہ کرامؓ کا گروہ ہی سب سے افضل ہے اور قرآن کریم کا فہم حاصل کرنے والا بھی ان سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ’’مشکوٰۃ المصابیح‘‘ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اس گروہ کے اوصاف نہایت لطیف پیرائے میں بیان فرمائے ہیں:

مَنْ کَانَ مُسْتَنًّا فَلْیَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ، فَاِنَّ الْحَیَّ لَا تُؤْمَنُ عَلَیْهِ الْفِتْنَةُ، اُولٰئِکَ اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ، کَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ، اَبَرَّهَا قُلُوْبًا، وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَاَقَلَّهَا تَکَلُّفًا، اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِیِّهٖ ﷺ، وَلِاِقَامَةِ دِیْنِهٖ، فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰی آثَارِهِمْ، فَاِنَّهُمْ کَانُوْا عَلَی الْهُدَی الْمُسْتَقِیْمِ

’’جو اسوہ و نمونہ کا متلاشی ہو اُسے چاہیے کہ ان کو اُسوہ بنائے جو وفات پا چکے ہیں، اس لیے کہ زندہ پر فتنہ کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ لوگ اصحابِ محمد ﷺ ہیں، وہ اس اُمت کے افضل ترین حضرات تھے، اُمت میں سب سے زیادہ پاکیزہ دل تھے اور سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے تھے اور کم سے کم (نہ ہونے کے برابر) تکلف والے تھے، جن کو پسند اور منتخب کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی رفاقت کے لیے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے، لہٰذا تم ان کی بزرگی کو پہچانو اور ان کے نقوشِ پا کی پیروی کرو، کیونکہ وہ حضرات ہدایت یافتہ اور سیدھے راستے پر تھے۔‘‘

گویا حضرات صحابہؓ کی تفسیر کے مقابلے میں کوئی دوسری تفسیر نہ صرف قابلِ اعتبار نہیں بلکہ قابلِ اعتناء بھی نہیں۔ صحابہ کرامؓ کے حوالے سے اوپر بیان کردہ اوصاف ایسے ہیں جو علم کے صحیح اور اہلِ علم کے مستند ہونے کے لیے معیار و بنیاد ہیں۔ جن پاکباز اشخاص کی زندگی ان اوصاف کا مظہر ہو گی، انہی کو کتاب اللہ کی تفسیر کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ محض لغت و ادب، جاہلی شاعری، تاریخی واقعات یا عقل و درایت میں مہارت ہونے سے کوئی فنِ تفسیر کا صحیح ماہر اور حق دار نہیں بن سکتا۔

قسم چہارم کہ ان امور کا بیان کرنا جو لغت اور قواعدِ عربیہ سے متعلق ہوں، اس سے مراد قرآن کریم کے وہ اَسرار و لطائف ہیں جن سے اعجازِ قرآن نمایاں اور واضح معلوم ہو۔ جس طرح کتابِ الٰہی کے معارف و حقائق کی کوئی حدود متعین نہیں، اسی طرح اس کی معجزانہ شان کی کیفیات اور صورتیں بھی بے شمار ہیں۔ ائمہ مفسرین نے اعجازِ قرآن کے کچھ اصول و کلیات ایسے بیان فرمائے ہیں جو بہت سی وجوہِ اعجاز پر مشتمل ہیں۔ قاضی عیاض کا ’’شفا‘‘ میں کہنا ہے کہ اعجازِ قرآن کی صورتیں تو

بہت سی ہیں، جن کا احاطہ مشکل ہے، البتہ وہ انواع جو اکثر وجوہِ اعجاز کے لیے جامع ہیں، چار ہیں:

(ا) قرآن کریم کا حسنِ تالیف، کلمات و آیات کا باہمی ارتباط و تناسب اور ان کا وہ معیارِ فصاحت و بلاغت جس نے اہلِ دنیا کو عاجز کر دیا۔ میدانِ بلاغت کے عربی شہسواروں نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

(ب) نظم قرآنی کی وہ عجیب و غریب اور نرالی طرز جو عربی نظم و نثر کے ہر اسلوب اور رنگ سے جدا اور ممتاز نظر آتی تھی۔ عرب کے شعراء، خطباء اور بلغاء نظم قرآنی کو نظم و نثر کی مختلف انواع و اقسام سے مختلف اور جدا پا کر متحیر ہوئے تھے کہ یہ طرزِ کلام اور اندازِ بیان آخر کون سے معیار پر ہے!

(ج) اُمم سابقہ اور گزرے زمانے کے ان واقعات کو بیان کرنا جن کو ایک اُمّی شخص تو درکنار بہت سے اہلِ علم اور اہلِ کتاب بھی نہ جانتے تھے۔ ایسے گزرے واقعات کو ڈنکے کی چوٹ اس اعلان کے ساتھ بیان کرنا کہ یہ واقعات ثابت اور برحق ہیں اور اللہ کی طرف سے آپؐ پر وحی کیے گئے ہیں، یہ قرآن کا کھلا اعجاز ہے۔ قرآن پاک نے تو ان واقعات کو بھی تحقیق و تثبیت کے اسلوب میں بیان کیا ہے جن میں خود اہلِ کتاب اور بنی اسرائیل باہم اختلاف کرتے تھے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَکْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۷۶﴾﴾ (النمل)

’’بے شک یہ قرآن بیان کرتا ہے بنی اسرائیل کے اکثر وہ واقعات جن میں وہ خود اختلاف کر رہے ہیں۔‘‘

(د) قرآن مجید میں غیب کی خبروں اور آنے والے واقعات پر مشتمل بیان ہونا، اور پھر ہر آنے والی خبر کا اسی طرح ظہور پذیر ہونا۔ قرآن کریم نے جن جن واقعات کی خبر دی، وہ صبح صادق کی طرح دُنیا کی نگاہوں کے سامنے آ کر اور ہو کر رہے۔ مثلاً خدائے بزرگ و برتر نے فارس (ایران) پر روم کے غلبے کی خبر دی جبکہ عالمِ اسباب میں دُور دُور تک اس کا کوئی امکان نہ تھا۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ﴾ (الروم)

’’مغلوب ہو گئے رومی قریب کی سرزمین (فارس) میں، لیکن یہ لوگ (رومی) اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند سالوں میں ہی (فارس پر) غالب آ جائیں گے۔‘‘

فارس (ایران) کے آتش پرست مجوسیوں کو مشرکین مکہ مذہباً اپنے نزدیک سمجھتے تھے۔ اسی طرح روم کے نصاریٰ کو اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے قریب جانتے تھے۔ تو اہلِ فارس کے غلبہ کی خبر پر مشرکین مسرور ہوئے اور کہنے لگے کہ آج ہمارے بھائی اہلِ فارس نے تمہارے بھائی اہلِ روم کو شکست دے دی ہے‘ ہم بھی اسی طرح تمہیں شکست سے ہمکنار کریں گے اور تمہارا نام ونشان مٹ جائے گا۔ اس موقع پر قرآن حکیم نے ظاہری سلسلہ اسباب کے بالکل خلاف یہ اعلان کیا کہ بے شک اس وقت تو اہلِ روم‘ اہلِ فارس سے مغلوب ہو گئے ہیں‘ لیکن چند سال کے اندر دوبارہ اہلِ روم کامیاب اور غالب ہوں گے۔ چنانچہ کلام اللہ کی پیشین گوئی کے عین مطابق ٹھیک نو سال کے اندر عین یومِ بدر پر (جبکہ مسلمان نصرتِ خداوندی سے مشرکینِ مکّہ پر فتح حاصل کر کے خوشیاں منا رہے تھے) یہ خبر مسلمانوں کی مسرتوں میں مزید اضافے کا باعث بنی کہ اہلِ روم (اہلِ کتاب) کو اللہ تعالیٰ نے فارس کے مجوسیوں پر غالب کر کے فتح عطا فرمائی ہے۔

اسی طرح ’’الاتقان فی علوم القرآن‘‘ میں قاضی ابوبکر کا قول ہے کہ قرآن کریم کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس کی تالیف وترتیب اور کلمات وآیات کا تناسب کچھ ایسے اسلوب پر واقع ہوا ہے جو کہ عرب کے تمام متعارف طریقوں سے جدا اور نرالا تھا۔ عرب میں نظم ونثر کے جتنے بھی اسلوب تھے‘ ان میں سے کوئی بھی قرآن مجید کے طرزِ بیان کے مشابہ نہ تھا۔ اس مرتبۂ اعجاز کے ساتھ بدیع کی تمام اقسام بھی کلام اللہ میں کچھ اس طرح سے جمع ہیں کہ دنیا کے کسی کلام میں بھی اس کی نظیر نہیں مل سکتی ہے۔

قسم پنجم کہ یہ تفسیر کا وہ اسلوب ہے جو پہلی بار چار اقسام میں سے کسی بھی ذریعہ سے ثابت اور متعین نہ ہو‘ بلکہ اہلِ علم اور مفسّرین اس میں مختلف آراء رکھتے ہوں۔ جیسے مقطعاتِ قرآنیہ (یعنی الٓمّٓ‘ حٰمٓ) جیسے حروف جو مختلف سورتوں کی ابتدا میں ہیں) کہ ان کی کوئی تفسیر کسی قطعی اور ظنی دلیل سے ثابت نہیں کہ جمہور مفسرین اس پر اتفاق کرتے ہوں۔ اسی طرح آیت قرآنی ﴿وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الرُّوۡحِ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:۸۵) میں رُوح کا مطلب اور اس کا حقیقی مفہوم کسی قطعی دلیل سے متعین نہیں۔ اور پھر تمام متشابہاتِ قرآنیہ پر سکوت وتوقف کا حکم دیا گیا کہ ان کا بالکل صحیح علم ہمارے پاس نہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشادِ ربانی ہے کہ ﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ﴾ (آیت ۳۶) ’’اور جس بات کا تمہیں علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑو۔‘‘

اس قسم کی آگے دو ضمنی انواع ہیں: (ا) جس میں غور وخوض اور بحث ومباحثہ نہایت خطرناک ہے‘ جیسے صفاتِ خداوندی اور متشابہات کی حقیقت۔ امام مالکؒ سے آیت قرآنی ﴿اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی﴾ کی تفسیر کے بارے سوال کیا گیا تو آپ نے سکوت فرمایا۔ جب سائل نے بار بار دریافت کیا تو جواب ملا: الاستواء معلوم والکیف مجهول والسوال عنه بدعة ’’عرش پر استواء معلوم اور یقینی ہے‘ اور اس کی کیفیت مجہول ہے‘ اور اس کے بارے میں سوال اور تحقیق بدعت ہے‘‘۔ (ب) اس میں تحقیق وتفتیش اس درجہ ممنوع نہیں‘ جیسے کہ اس درخت کا تعین جس کا پھل بہشت میں حضرت آدمؑ نے کھالیا تھا یا اصحابِ کہف کے ناموں کی تحقیق وغیرہ۔ دیگر وہ اُمور جو کلام اللہ میں قدرے مبہم اور مجمل طور پر ذکر کیے گئے ہیں۔ اگرچہ ان امور کے تعین میں کوئی صحیح الاسناد روایت منقول نہیں‘ بایں ہمہ ان امور پر کلام وتفتیش بالکل منع بھی نہیں۔

صحتِ تفسیر کے اصول

درج ذیل اصولوں کا جاننا اور ان پر عمل پیرا ہونا صحت تفسیر کے لیے لازم ہے:

(۱) آیاتِ قرآنی کی تفسیر نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی روایت کردہ تفسیری مرویات کے مطابق ہو‘ یا پھر تفسیر مرفوع اور اقوالِ صحابہؓ سے ماخوذ ومستنبط ہو۔

(۲) قرآنی سیاق وسباق کے مطابق ہو۔

(۳) قواعدِ عربیہ اور اہلِ زبان کے استعمال کے موافق ہو۔

(۴) اصولِ دین وشریعت اور ان تمام قواعد کے مطابق ہو جو دین میں مقرر وثابت ہیں اور ان پر اعتقاد وایمان لازم ہے۔

(۵) اصول ومقاصدِ قرآن کے تحت ہو۔

چنانچہ اب:

(ا) کسی آیت کی کوئی ایسی تفسیر معتبر نہ ہوگی جو حدیثِ مرفوع اور صحابہ کرامؓ کی تفسیری روایات کے خلاف ہو۔ مثلاً: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۪ۚ﴾ (البقرۃ:۶۲) کی تفسیر میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہود ونصرانیت اور تمام ادیانِ سماویہ کی اصل ایک ہی چیز ’’ایمان باللہ والیوم الآخر اور عمل صالح‘‘ ہے‘ اس لیے ان تمام مذاہب سماویہ پر عمل کرتے ہوئے انسان

اُخروی نجات کا مستحق ہو سکتا ہے اور نجات صرف اسلام پر ہی منحصر نہیں‘ تو ایسی تفسیر کرنا ایک کھلی تحریف اور دین اسلام کے اصولِ موضوعہ کا انکار ہے۔ احادیثِ صحیحہ کی رُو سے ’مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ‘ کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا بھی فرمایا گیا ہے۔ اصولِ شریعت میں طے ہو چکا ہے کہ ایمان باللہ کا مفہوم توحید و رسالت پر ایمان لانا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ رَجُلٌ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ یَھُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ ثُمَّ لَا یُؤْمِنُ بِیْ اِلَّا دَخَلَ النَّارَ))

’’قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے‘ میری اس اُمت میں جو شخص بھی میری بابت سن لے چاہے وہ یہودی ہو یا عیسائی (یا کسی بھی اور مذہب کا)‘ پھر وہ مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں جائے گا۔‘‘

قرآن کریم کی دوسری آیات ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ ۣ﴾ (آل عمران:۱۹) اور ﴿وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۭ﴾ (المائدۃ:۳) نیز ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۚ﴾ (آل عمران:۸۵) بھی اس قسم کے مفہوم اور تفسیر کو باطل اور اصولِ شریعت کے خلاف قرار دے رہی ہیں۔

(ب) آیاتِ قرآنی کی کوئی ایسی توضیح اور تفسیر بھی معتبر نہ ہوگی کہ جس کا اعتبار کرنے سے کلام اللہ کے سیاق و سباق میں کوئی ربط ہی باقی نہ رہے۔ جیسے آیت ﴿فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۰) کے ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یہ معنی کیے جائیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بات کا حکم دیا گیا کہ چار پرندے مختلف پہاڑوں پر بٹھا دو‘ پھر ان کو آواز دو تو وہ تمہاری آواز پر مانوس ہو کر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس آئیں گے اور اس سے پھر اس قسم کے (خود ساختہ) مفسرین یہ مفہوم نکالیں کہ اگر وحشی اور بے عقل پرندوں کے چند دنوں کے انس اور تربیت سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ تربیت یافتہ ہو کر تمہاری بات اور حکم کو قبول کرنا شروع کر دیں‘ تو کیا پھر دعوتِ حق سے انسانوں میں یہ تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی کہ ان کی بھی تربیت ہو جائے اور وہ تمہاری دعوت اور تعلیم کو قبول کرنے لگیں؟ اس طرح کی بظاہر خوش نما تفسیر دراصل مکمل تحریف ہے۔ جمہور مفسرین اور علمائے سلف نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے‘ اس کے مطابق

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہاڑوں پر ان کے مختلف حصے رکھ دو۔ پھر ان پرندوں کو آواز دو تو وہ قدرتِ خداوندی سے دوبارہ زندگی پا کر تمہاری آواز پر دوڑتے ہوئے تمہارے پاس چلے آئیں گے۔ تو اے ابراہیم! اس کو دیکھ کر تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کی کیفیت کو سمجھ لینا‘ جس کے بارے میں تم نے سوال کیا اور اس حالت کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تھا۔ اب اس مقام پر جمہور مفسرین کی پیروی کرنے کی بجائے نیا مفہوم اور توضیح اختیار کر لینا اس آیت کی تشریح اور سیاق وسباق میں ربط کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ یوں مقصد بالکل ختم ہو کے رہ جاتا ہے جو اس موقع پر بیان کرنا مقصود ہے۔ اس طرح کی تفسیر سے اس واقعہ کی ساری اعجازی حیثیت بالکل نظروں میں باقی نہیں رہتی اور مُردوں کو زندہ کر کے دکھانے کا سوال جوں کا توں اپنی جگہ رہتا ہے۔

(ج) اور نہ ہی قرآن کریم کی وہ تفسیر معتبر اور مستند ہو گی جو قواعدِ عربیہ اور اہلِ زبان کے استعمال اور قواعد کے خلاف ہو۔ جیسے ﴿اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْحَجَرَ ۭ﴾ (البقرۃ:۶۰) کا مطلب یہ بتایا جائے کہ لاٹھی کے سہارے پہاڑ اور پتھر پر چڑھنا‘ یعنی تم پہاڑ پر چڑھو وہاں تم کو چشمے بہتے ہوئے ملیں گے۔ اب اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر سے پانی کے چشموں کا نکلنا مراد نہ لیا جائے‘ تو یہ تفسیر قواعدِ عربیہ اور اہلِ لغت وزبان کے استعمال کے خلاف ہوگی۔ اس کے علاوہ اللہ کے رسولؑ کے ہاتھوں جو ایک عظیم الشان معجزے کا ظہور ہوا‘ اس سے بھی اعراض اور اس کا انکار کرنا ہے۔ مزید برآں اس ضمن میں حضور ﷺ کے ارشادات سے بھی قطعی روگردانی ہے۔

(د) قرآنی آیات کی اس تفسیر کا بھی اعتبار نہیں ہو گا جس سے عقائدِ ایمانی‘ اصولِ شریعت‘ امورِ شریعت اور احکامِ شریعت کا ابطال اور انکار لازم آتا ہو۔ مثلاً کوئی سی ایسی تشریحات اور توضیحات جن سے انکارِ معجزات‘ حشر و نشر‘ جسمانی وزنِ اعمال اور انکارِ ملائکہ اور شیاطین ثابت ہوتا ہو۔ بعض لوگوں نے قرآن کی وضعی تفسیر ہی اس لیے کی کہ ان تمام حقائق کا ردّ کیا جائے جس پر دین کی بنیادیں قائم ہیں۔ راہِ حق کے اس قسم کے منحرفین کے لیے نہ جنّت کوئی عالم ہے اور نہ ہی اس کی وہ نعمتیں کوئی حقیقت رکھتی ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح نہ جہنّم کوئی عالم ہے اور نہ ہی اس میں وہ عذاب و آلام ہیں جن کا ذکر کتاب اللہ بار بار کرتی ہے۔

(ہ) اور نہ ہی الہامی آیات کی وہ تفسیر معتبر کہلائے گی جس سے مقاصدِ قرآن کا ختم ہونا لازمی نظر آتا ہو۔ جس طرح کہ قرآنی آیات کی قرآن کریم کے حقیقی مقاصد سے مطابقت پیدا کرنے کی

بجائے انہیں اصولِ فلسفہ و سائنس، صنعتی ترقیات اور جدید ایجادات اور دریافتوں پر منطبق کیا جائے۔ اس کا نام مقصد کائنات تجویز کر کے تمام آیاتِ قرآنی کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے‘ اور مفروضہ مقصدِ کائنات کی تشریح وتوضیح کو ہی کلام اللہ کا مقصدِ اعظم قرار دیا جائے۔

مندرجہ بالا وہ اصولِ خمسہ ہیں جن کی رعایت اور پیروی کرتے ہوئے تفسیر قرآن کرنا تمام جمہور علماء اور محققین کے نزدیک ضروری ہے۔ ان اصولوں کے خلاف ہر تفسیر کو تفسیرِ قرآن کی بجائے تحریفِ قرآن کہا اور سمجھا جائے گا۔

تفسیر بالرائے کا مقام

قرآن کریم کی تفسیر کے معتبر ہونے کے جو مندرجہ بالا پانچ اصول بیان کیے گئے ہیں‘ ان کی رعایت اور پابندی نہ کرتے ہوئے کسی آیت کی کوئی تشریح کرنا تفسیر بالرائے کہلائے گا۔ ایسی ہی تشریح اور تفسیر کرنے والوں کے بارے میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ﴾ (الجاثیۃ:۲۳) ’’کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنا معبود بنا رکھا ہے اپنی خواہش (نفس) کو اور گمراہ کر دیا اُس کو اللہ نے (اس کی بدبختی کی بدولت) باوجود اُس کے علم کے اور مہر لگا دی اُس کے کان اور اُس کے دل پر اور ڈال دیا پردہ اس کی نگاہ پر‘‘۔ حافظ ابن کثیر مقدمہ تفسیر میں واضح کرتے ہیں کہ تفسیر قرآن محض رائے سے کرنا حرام ہے‘ جیسا کہ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ ----- اَوْ بِمَا لَا يَعْلَمُ ----- فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (رواہ الترمذی والنسائی) ’’جس کسی نے قرآن میں کوئی بات اپنی رائے سے کہی‘ یا وہ بات کہی جس کو وہ نہیں جانتا‘ اُس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے‘‘۔ اور ابن جریر نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ((مَنْ قَالَ فِی الْقُرْآنِ بِرَأْيِهٖ فَقَدْ اَخْطَاَ)) (رواہ الترمذی و ابوداؤد) ’’جس شخص نے قرآن میں (قرآن کے حوالے سے) کوئی بات اپنی رائے سے کہی تو یقیناً اُس نے خطا اور غلطی کی‘‘۔ اسی حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جس نے کتاب اللہ میں کوئی بات اپنی رائے سے کہی اور وہ بات درست بھی کہی ہو‘ تب بھی اُس نے خطا کی۔ اس لیے کہ اُس نے تکلف کیا اُس کام کا جس کو وہ نہیں جانتا تھا اور وہ طریقہ اس

نے اختیار کیا جس کی اس کو اجازت نہیں دی گئی تھی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہتان لگانے والے کو جھوٹا کہا اور فرمایا: ’’پس جب وہ دو گواہ پیش نہ کر سکیں تو وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں‘‘۔

امام قرطبی‘ ابوبکر انباری کا قول نقل فرماتے ہیں کہ حدیثِ ابن عباسؓ میں نہ جانتے ہوئے بات کہنے کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ مشکلات قرآن کے حل اور تفسیر میں ایسی کوئی بات بیان کر دی جو صحابہ کرامؓ اور تابعین سے ماثور نہیں اور نہ ہی ان کے اقوال سے وہ مستنبط ہے‘ تو ایسی تفسیر کرنے والا اللہ کی ناراضگی کا نشانہ بنتا ہے۔ دوسرا معنی یہ کہ جو شخص تفسیرِ قرآن میں کوئی ایسی بات کہے جس کو وہ جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے اور یہ بات حق پر بالکل پوری نہیں اترتی‘ تو پھر ایسی تفسیر کرنے پر اس کو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لینا چاہیے۔ حدیث جندبؓ کی شرح میں اسلاف نے یہی مراد لیا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں کوئی قول اپنی خواہش کے مطابق ایسا اختیار کرے جس کا کوئی ماخذ اور اصل صحابہ کی تفسیر اور متقدمین کے فرمودات میں نہ ہو تو فی نفسہٖ اگرچہ یہ بات صحیح بھی ہو‘ لیکن بایں ہمہ یہ خطا اور غلطی ہے‘ کیونکہ اس نے قرآن کے حوالے سے بلا اصل اور بنیاد کے ایک رائے اختیار کی۔ قرآن پاک کی تفسیر میں ہر بات سلف صالحین کی دلیل کے ساتھ ہی معتبر ہو سکتی ہے۔ بے ثبوت اور بلا اصل کوئی قول بھی تفسیر میں حجت اور سند کا درجہ نہیں رکھتا۔

اب دیکھیے! کسی زمانے کا کوئی واقعہ یا کسی شخص کی کوئی حکایت بھی اگر بیان کی جاتی ہے‘ تو اس کی ساکھ اور سند کے قابلِ اعتبار ہونے کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی شان تو سب سے اعلیٰ اور ارفع ہے‘ اس لیے لازماً ہر اُس قول اور کلام کے لیے محکم ثبوت کی ضرورت ہے جس کو کہا جائے کہ یہ اللہ کی مراد ہے۔ ابن عطیہ سے منقول ہے کہ مذکورہ حدیث سے مراد اس شخص کی تفسیر ہے جو کلام اللہ کے بیان اور شرح کرنے میں نہ تو صحابہ کرامؓ کے اقوال و آراء کو پیشِ نظر رکھے اور نہ ہی اصولِ شریعت اور قواعد عربیہ کی رعایت کرے۔ اس ممانعت میں ظاہر ہے کہ اہلِ لغت اور اربابِ بلاغت کی لغوی تحقیقات یا لطائف عربیہ اور اسی طرح فقہاء و مجتہدین کا احکامِ فقہ کا استنباط شامل نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ یہ سب امور اصول و قواعد پر مبنی اور سلف صالحین کی تشریحات سے ہی ماخوذ ہیں۔

’’احکام القرآن‘‘ میں امام قرطبی اس طرح کے متعدد اقوال نقل کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کا منشا و مقصد انسان کا اپنے معتقدات اور خیالات کی جانب ذہنی رجحان ہوتا

ہے۔ خیالات و آراء کا رجحان انسان کو فطرتاً اپنی خواہشات کی طرف مائل کرتا ہے اور یہ میلان اور جذبات اس کو قلباً اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ آیات کی تشریحات کو اپنے ذوق اور سوچ کے مطابق بنائے۔ اس صورت میں کبھی تو ایسا ہوگا کہ آیاتِ قرآنی کے مفہوم کی تحقیق اور تعیین میں خیالات و جذبات کی آمیزش غالب آجائے گی' اور خود بخود اس کا فکر اور ذہن اسی جانب مائل اور متوجہ ہوگا جو خود اُس شخص کا ذاتی ذوق اور اختیار کردہ غلط مسلک اور سوچ ہے۔ اور کبھی یوں ہوگا کہ کوئی شخص دیدہ و دانستہ تلبیس کرے گا اور قرآن کریم کے معنی و مفہوم کو طرح طرح کے تکلفات اور تاویلات کر کے اپنی خواہش اور سوچ کی طرف پھیرے گا اور اپنا من پسند مفہوم نکالے گا۔ جیسے کہ اہل بدعت و ہواء آیاتِ قرآنی کی ایسی ایسی بعید از قیاس تشریحات کرتے ہیں جس کا مقصد اپنی اختیار کردہ بدعات اور رسومات کی تائید حاصل کرنا ہوتا ہے' حالانکہ وہ اندر سے جانتے ہیں کہ آیت کا حقیقی معنی یہ نہیں جو کہ ہم بیان کر رہے ہیں۔ محض عناد اور اپنی خواہش نفس کی پیروی میں وہ قرآنی مفاہیم کی تاویلاتِ بعیدہ کرتے ہیں' تاکہ اپنے مقابل پر حُجّت قائم کر سکیں اور ان تاویلات رکیکہ سے آیاتِ الٰہیہ کی تشریحات کو اپنے ذوق اور مشرب کے مطابق بنا سکیں۔ گویا ان کا مطمحِ نظر خود حق کے مطابق ڈھلنا نہیں بلکہ حق کو اپنے مطابق ڈھالنا ہوتا ہے۔

گویا مندرجہ بالا دونوں صورتیں تفسیر بالرائے کی ہیں۔ پہلی صورت جہل عن الحق اور ضلال (گمراہی) کا درجہ ہے جبکہ دوسری صورت تلبیس اور کتمانِ حق (یعنی باطل کو برنگ حق ظاہر کرنے اور اصل حق کو چھپانے) کی ہے۔ اسی طرح کے ایک گروہ یہود کے طرزِ عمل کو قرآن کریم میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَاِنَّ فَرِیۡقًا مِّنۡهُمۡ لَیَکۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾﴾ (البقرۃ) ''اور بے شک ان میں سے ایک جماعت حق کو چھپاتی ہے حالانکہ وہ جانتے ہوتے ہیں (کہ حق کیا ہے)''۔ اُمت مسلمہ کے منحرفین جتنی بھی تلبیس بین الحق والباطل کی تدابیر کر لیں' یہ کارگر نہیں ہو سکتیں۔ سنّتِ الٰہیہ ہے کہ آخر کار حق اور باطل علیحدہ ہو کر بشری مخلوق کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿لِیَمِیۡزَ اللّٰهُ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ﴾ (الانفال:۳۷) ''تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے علیحدہ کر دے۔''

ابن النقیب بیان کرتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کے معاملے کی وضاحت میں جو اقوال مل پاتے ہیں' وہ پانچ ہیں: اوّل یہ کہ تفسیر بالرائے یہ ہے کہ انسان ان علوم کے حاصل کیے بغیر تفسیر

کرے جن کے ساتھ تفسیر کرنے کی اجازت ہے (یعنی ایسے علوم کی تحصیل کیے بغیر تفسیر کرنا جائز نہیں)۔ دوم یہ کہ ان متشابہات کی تفسیر کرے جن کی (حقیقی) مراد اور مفہوم اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ سوم یہ کہ مذاہب فاسد اور باطل کی حمایت اور تائید کے لیے تفسیر کرے' جس کی صورت یہ ہے کہ اس (باطل) مذہب کو اصل بنا کر تفسیر کو اس کے تابع کر دے اور آیاتِ قرآنیہ کو امکان بھر اسی مذہب کی طرف پھیرے' خواہ کسی ضعیف سند کے ذریعے ہی (اس طرح کی تاویل بعید) اختیار کرے۔ چہارم یہ کہ نبی کریم ﷺ' صحابہؓ اور اسلاف کی پیروی نہ کرتے ہوئے کسی دلیل اور سند کے بغیر تشریح میں یہ دعویٰ کرے کہ حق تعالیٰ کی مراد بالکل یہی ہے۔ پنجم یہ کہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کے مطابق آیات کی تاویل کرے اور جو امور اور باتیں اس کو پسند آئیں' آیات کو بھی انہی کی طرف راجع کرے۔

اسی ضمن میں سورۂ بنی اسرائیل میں فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾﴾ ''جس بات کی تجھے خبر ہی نہ ہو اس کے پیچھے مت پڑ' بے شک کان اور آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک سے پوچھ گچھ کی جانے والی ہے''۔ ایک دوسرے مقام پر سورۃ القصص میں ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیۡرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''اُس سے زیادہ گمراہ اور کون شخص ہو سکتا ہے جس نے اپنی خواہش (نفس) کی پیروی کی بغیر اللہ کی کسی ہدایت (رہنمائی) کے' بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت عنایت نہیں کرتا۔''

تفسیری کلام میں صوفیاء اور عارفین کے اقوال کا مقام

علامہ آلوسی کا کہنا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے بارے میں صوفیاء اور عارفین کا کلام بطریق تفسیر نہیں ہوتا' کیونکہ ان کی تفسیر تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی بیان کردہ مراد کا نام ہے' بلکہ وہ تو صرف رموز و اشارات اور ایسے لطائف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر القاء کرتا ہے۔ اربابِ سلوک کے قلوب باطنی ریاضتوں کی وجہ سے منور ہوتے ہیں اور ان پر تجلیاتِ غیبیہ کا ورود ہوتا رہتا ہے۔ گاہ بگاہ ان کی زبان سے کلام اللہ کی تشریح میں کچھ ایسے لطائف و معارف جاری ہوتے ہیں کہ جن کا تعلق ظاہری علوم سے نہیں ہوتا' بلکہ وہ صرف روحانی تلقین اور تفہیم غیبی ہوتے ہیں۔ مگر یہ باطنی اشارات قرآن کریم کے اُس مفہوم اور مدلولِ قطعی کو برقرار رکھتے ہوئے معتبر ہوں

گے جو اصولِ شریعت‘ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی تفسیر سے ثابت ہوتے ہیں۔ اگر اربابِ تصوّف سے کوئی ایسی بات منقول ہو کہ جس سے ظاہری احکامِ شریعت اور حدود اللہ کا انکار لازم آتا ہو یا ان میں بنیادی تغیّر پیدا ہوتا ہو‘ تو وہ اشارات یا لطائف ہرگز قبول اور معتبر نہ ہوں گے۔ قابلِ اعتبار تو صرف وہی نکات‘ اشارات یا لطائف ہوں گے جن سے نہ تو احکامِ شریعت پر کوئی زد پڑتی ہو اور نہ ہی کسی ایسے امر کا صراحتاً یا دلالتاً ردّ لازم آتا ہو جو کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہؓ سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے۔ حضرت حسن بصریؒ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لِكُلِّ آيَةٍ ظَهْرٌ وَبَطْنٌ ' وَلِكُلِّ حَرْفٍ حَدٌّ وَلِكُلِّ حَدٍّ مُطَّلَعٌ)) ’’ہر آیت کے لیے ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے‘ اور ہر حرف کے لیے ایک حد یعنی حکم شرعی ہوتا ہے‘ اور ہر حکم شرعی کے لیے (کتاب اللہ میں) ایک اطلاع پانے (باخبر ہونے) کی جگہ ہوتی ہے۔‘‘

ابن النقیب کا بیان ہے کہ ظہر آیات سے مراد وہ معانی ہیں جو کہ اہلِ علم ظاہری علوم اور قواعد شرعیہ کے ذریعے جانتے ہیں‘ اور بطن آیات سے مراد وہ اسرار ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے صوفیاء اور عارفین کے قلوب پر القاء فرماتے ہیں۔ اور اس سے آگے کی عبارت کے معنی یہ ہیں کہ ہر حرف کے معانی اور حقائق کا ایک منتہا ہوتا ہے۔ اسی کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر ارشادِ نبویؐ ہے: ((هُوَ الَّذِيْ لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ)) یعنی ’’قرآن مجید وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب (ولطائف ونکات) کبھی ختم نہ ہوں گے‘‘۔ دراصل مدلولِ قرآنی تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی تفسیر سے مقرر و متعین ہے جس میں کسی بھی قسم کے ردّ و بدل کا امکان نہیں۔ اسی مدلولِ قطعی اور طے شدہ مفہوم (جس پر تمام احکامِ شریعت کا دار و مدار ہے) کے بعد باطنی اسرار و نکات اور معارف کی کوئی انتہا نہیں۔ شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ ’’لطائف المنن‘‘ میں تحریر کرتے ہیں کہ کلام اللہ اور حدیثِ رسولؐ کی تشریح میں حضرات صوفیاء و عارفین کے نکات اور اس سے متعلقہ غرائب (مخفی معنی) بیان کرنا‘ کلام اللہ کو اس کے ظاہری مفہوم سے متغیر کرنا نہیں ہے‘ کیونکہ آیت کا ظاہر مفہوم تو وہی مراد ہوتا ہے جس پر کہ آیت ناطق (واضح) ہے اور اسے قواعد عربیہ اور اصولِ شریعت سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ غرائب محض رموز و اشارات اور باطنی تفہیم کے درجے پر ہیں جو کہ غیبی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اربابِ باطن پر القاء کیے جاتے ہیں۔

(جاری)

❁❁❁

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

ہر قوم وملّت کا شعار ہے کہ وہ ملاقات کے وقت خوش آمدید کے قبیل کے الفاظ کہتے ہیں۔ ہندو نمستے یا رام رام کہتے ہیں۔ انگریز صبح کے وقت ملیں تو گڈ مارننگ (اچھی صبح)، شام کو ملیں تو گڈ ایوننگ (اچھی شام) اور رات کو ملاقات کریں تو گڈ نائٹ (اچھی رات) کہتے ہیں۔ عرب کے لوگ اسلام کی آمد سے پہلے اَنْعَمَ اللّٰہُ بِکَ عَیْنًا ''اللہ تمہیں آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب کرے'' یا اَنْعِمْ صَبَاحًا ''تمہاری صبح خوشگوار ہو'' کہا کرتے تھے۔ جب اسلام آیا تو یہ الفاظ چھوڑ کر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کے الفاظ سکھائے گئے۔ یہ دعائیہ کلمہ محبّت و پیار اور اپنائیت کا آئینہ دار ہے۔ اس میں خیر اندیشی کا اظہار بھی ہے اور ملنے والے کی طرف سے دعا بھی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے۔

قرآن مجید میں ہے رسول اللہ ﷺ کو کہا گیا کہ جب اہلِ ایمان آپ کے پاس آئیں تو ان سے کہیے: ﴿سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ﴾ (الانعام:۵۴) ''سلامتی ہو تم پر، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا ہے''۔ جب جنّتی لوگ جنّت میں داخل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جائے گا: ﴿اُدْخُلُوْھَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الحجر) ''سلامتی اور امن کے ساتھ اس (جنّت) میں داخل ہو جاؤ۔''

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ نہایت مناسب جملہ ہے جو ملاقات کے وقت بولا جائے۔ اسلام کی یہ بڑی مبارک تعلیم ہے۔ پھر یہ بڑی فضیلت اور اجر وثواب کا بھی باعث ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو پیدا کیا تو ان سے فرمایا: ''جاؤ اور اس جماعت کو سلام کرو۔ وہ فرشتوں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے اور سنو وہ تم کو جو جواب دیتی ہے وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا جواب ہے۔ چنانچہ آدمؑ گئے اور فرشتوں کو مخاطب کر کے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔ فرشتوں نے جواب میں کہا: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ یعنی انہوں نے وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ کے الفاظ زیادہ کہے۔ (بخاری ومسلم) اس سے معلوم ہوا کہ سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا حضرت آدم علیہ السلام سے ثابت ہے۔ گویا یہ قدیم ترین شعارِ اسلام میں سے ہے۔

سلام کو عام کرنا جنّت میں لے جانے والے کاموں میں سے ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم اُس وقت تک جنّت میں داخل نہ ہو گے جب تک کہ ایمان نہ لاؤ۔ اور اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہ ہو گا جب تک کہ آپس میں محبّت نہ کرو۔ کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں کہ جب تم اس پر عمل کرو تو تمہارے درمیان محبّت بڑھے، اور وہ یہ ہے کہ سلام کو رواج دو۔'' (مسلم)

مسلمان کے لیے سلام کرنا اور سلام کا جواب دینا نہایت پسندیدہ عمل ہے۔ ہر مسلمان ملاقاتی کو سلام کرنا چاہیے خواہ وہ واقف ہو یا ناواقف۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ؓ کہتے ہیں ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام میں سب سے بہتر عمل کون سا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''بھوکوں کو کھانا کھلانا اور سلام کرنا ہر اُس شخص کو جس کو تم جانتے ہو اور اُس کو بھی جو تمہارا آشنا نہ ہو۔'' (بخاری ومسلم)

اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا تو انسان کا مقصدِ تخلیق ہے۔ قرآن مجید میں جابجا عبادتِ ربّ کی تلقین ہے۔ پھر لوگوں کو کھانا کھلانا بھی پسندیدہ عمل ہے۔ اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ نے سلام کو رواج دینے کو جنّت میں داخلے کا سبب بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! رحمان کی عبادت کرو اور بندگانِ خدا کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو خوب پھیلاؤ۔ تم سلامتی کے ساتھ جنّت میں پہنچ جاؤ گے۔'' (ترمذی عن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ)

چونکہ سلام کرنا ایک پسندیدہ عمل ہے، اس لیے جب دو مسلمان آپس میں ملیں تو جو سلام کرنے میں پہل کرے گا وہ زیادہ اجر کا مستحق ہے، اگرچہ جواب دینے والا بھی اجر پاتا ہے۔ حضرت ابو امامہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لوگوں میں اللہ کے قریب اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔'' (جامع ترمذی)

پھر سلام کرنے میں پہل کرنے سے انسان میں عاجزی آتی ہے اور وہ تکبّر سے دور ہو جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سلام میں پہل

کرنے والا تکبر سے بَری ہے۔‘‘(شعب الایمان)

دوسرے مسلمان بھائی کو سلام کرنا اجر وثواب کا باعث ہے۔ حضرت عمران بن حصین ؓ کہتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے کہا السَّلام علیکم۔ آپؐ نے اُس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: دس (یعنی سلام کرنے کی وجہ سے اس بندے نے دس نیکیاں کمالیں)۔ پھر ایک اور آدمی آیا‘ اُس نے اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ کہا۔ آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ آدمی بیٹھ گیا تو آپؐ نے فرمایا: بیس (یعنی اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں)۔ پھر ایک تیسرا آدمی آیا۔ اُس نے کہا السَّلَامُ علیکم وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔ آپ ﷺ نے اُس کے سلام کا جواب دیا اور وہ مجلس میں بیٹھ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیس (یعنی اس شخص کو تیس نیکیاں مل گئیں)۔(جامع ترمذی)

حضرت ابوہریرہ ؓ سے مروی ایک حدیث میں ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حق بتائے گئے ہیں۔ ان حقوق میں پہلا حق یہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ کسی مسلمان بھائی سے ملاقات کرے تو السلام علیکم کہے۔

سلام کو رواج دینے کا حکم ہے یعنی اسے عام کرو۔ چنانچہ صحابہ کرام ؓ بار بار ایک دوسرے کو سلام کرتے اور اس کو نفع بخش جانتے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب تم میں سے کسی کی اپنے کسی مسلمان بھائی سے ملاقات ہو تو چاہیے کہ اُس کو سلام کرے۔ اگر اس کے بعد کوئی درخت یا کوئی دیوار یا کوئی چٹان ان دونوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اس کے بعد پھر سامنا ہو جائے تو پھر سلام کرے۔‘‘ (ابوداؤد) گویا جب بھی سلام کے الفاظ بولے جائیں گے بولنے والا ثواب پائے گا۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا کہ صحابہؓ بغیر کسی مقصد کے صرف سلام کرنے کی غرض سے آپس میں ملاقات کرتے۔ حضرت طفیل بن ابی کعب ؓ سے مروی ہے کہ وہ عبداللہ بن عمر ؓ کی خدمت میں آیا کرتے تھے تو وہ صبح کو ان کو اپنے ہمراہ بازار لے جاتے۔ جب بازار جاتے تو جس پرچون فروش تاجر یا مسکین یا کسی اور شخص پر حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کا گزر ہوتا تو وہ ضرور اس کو سلام کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ میں ایک دن حضرت عبداللہ بن عمر ؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ حسب دستور مجھ کو بازار لے جانے لگے۔ میں نے کہا: آپ بازار جا کر کیا کریں گے۔ نہ تو آپ کسی سے خرید وفروخت کے لیے بازار

میں کھڑے ہوتے ہیں اور نہ کسی چیز کے بارے میں آپ دریافت کرتے ہیں‘ نہ اس کا بھاؤ پوچھتے ہیں اور نہ بازار کی کسی اور مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں آئیے یہاں بیٹھ کر ہم کچھ باتیں کریں۔ اس پر حضرت عبداللہؓ نے فرمایا: ’’اے ابوبطن (اے بڑے پیٹ والے) کیونکہ طفیل کا پیٹ ذرا بھاری تھا۔ ہم تو صبح کو اس لیے بازار جاتے ہیں کہ جس سے ملاقات ہو اس کو سلام کرلیا کریں۔‘‘ (موطأ امام مالکؒ)

آدمی کا اپنے گھر آنا جانا ہوتا ہے۔ چاہیے کہ جب بھی کوئی اپنے گھر میں داخل ہو تو اپنے گھر والوں کو سلام کرے۔ اس طرح اُسے بھی اجر ملے گا اور سلام کا جواب دینے والوں کو بھی۔ حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’بیٹا جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرو۔ یہ تمہارے لیے بھی باعث برکت ہوگا اور تمہارے گھر والوں کے لیے بھی۔‘‘ (جامع ترمذی)

جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہو تو گھر والوں کو سلام کرے اور پھر گھر سے باہر جانے لگے تو بھی اہل خانہ کو سلام کرے۔ اس طرح گھر سے آتے جاتے وقت اجر ملے گا۔ حضرت قتادہؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جب تم کسی کے گھر میں جاؤ تو گھر والوں کو سلام کرو اور پھر جب گھر سے نکلو اور جانے لگو تو بھی نکلنے کا سلام کرو۔‘‘ (جامع ترمذی)

آپ ﷺ نے جہاں صلہ رحمی کی تاکید کی ہے‘ لوگوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دی ہے اور نماز تہجد کی فضیلت بیان کی ہے‘ وہاں ساتھ ہی آپؐ نے سلام کرنے کی بھی نصیحت کی ہے۔ حضرت ابو یوسف عبداللہ بن سلام ؓ بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: لوگو! باہم خوب سلام کیا کرو‘ محتاجوں کو کھانا کھلایا کرو‘ رشتہ داری کے تعلقات میں حسن سلوک کی رعایت رکھا کرو‘ اور جب لوگ سوئے پڑے ہوں تو تم راتوں کو نمازیں پڑھا کرو۔ ایسا کرو تو سلامتی کے ساتھ جنّت میں داخل ہوجاؤ!‘‘ (جامع ترمذی) جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ہر کام سلیقے سے کرنا سکھایا ہے‘ اسی طرح آپؐ نے سلام کرنے کے بھی آداب تعلیم کیے ہیں‘ اور جو کام آداب کی رعایت کے ساتھ کیا جائے اس کام میں خوبی در آتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے ہدایت فرمائی ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے‘ راستہ سے گزرنے والا بیٹھے ہوؤں کو سلام کرے‘ اور تھوڑے آدمی زیادہ آدمیوں کو سلام کریں۔ (صحیح بخاری)۔ ایک دوسری روایت

میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ سوار آدمی پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔ آپ ﷺ نے ملاقاتی کو بھی سلیقہ سکھایا ہے کہ سلام علیکم کہے اور اجازت لے کر اندر داخل ہو۔ حضرت ربعی بن خراشؒ بیان کرتے ہیں کہ ہم سے بنی عامر کے ایک شخص نے بیان کیا کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے کی اجازت چاہی اور آپؐ مکان میں تشریف فرما تھے۔ اس شخص نے کہا کیا میں داخل ہو جاؤں؟ یہ سن کر آپ ﷺ نے اپنے خادم سے فرمایا: ''اس شخص کے پاس جاؤ اور اس کو اجازت لینے کا طریقہ بتا دو۔ اس سے کہو کہ وہ کہے السلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ اس شخص نے خود آپ ﷺ کی بات سن لی اور عرض کیا: السلام علیکم! کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟ تو آپ ﷺ نے آنے کی اجازت دے دی اور وہ آپؐ کے پاس حاضر ہو گیا۔'' (ابوداؤد)

کسی سے سلام لیتے وقت اگر ہاتھ بھی ملایا جائے تو اسے مصافحہ کہتے ہیں۔ یہ سلام کی بہتر اور تکمیلی صورت ہے۔ اس سے محبّت اور اپنائیت ظاہر ہوتی ہے اور یہ اجر کا باعث بھی ہے۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دو مسلمانوں کی ملاقات ہو اور وہ مصافحہ کریں اور اس کے ساتھ اللہ کی حمد اور اپنے لیے بخشش طلب کریں تو ان کی بخشش ہو جائے گی۔ (سنن ابوداؤد) امام مالکؒ نے مصافحہ کو کینے کی صفائی کا ذریعہ بتایا ہے کہ اس سے باہم محبت پیدا ہوتی ہے اور ناراضگی دور ہوتی ہے۔

اہلِ ایمان کو حکم ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر سلام بھیجیں۔ چنانچہ آپؐ پر سلام بھیجنے کے مسنون الفاظ اس طرح ہیں: اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔ اسی طرح نماز کے آخر پر دائیں اور بائیں رخ پھیر کر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ کہہ کر دائیں اور بائیں طرف نمازیوں اور اپنے کندھوں پر متعین کراماً کاتبین کو سلام کیا جاتا ہے۔

نوٹ: سلام کے الفاظ لکھنے میں عام طور پر غلطی کی جاتی ہے۔ صحیح الفاظ اس طرح ہیں: اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یا سَلَامٌ عَلَیْکُمْ۔ دونوں الفاظ کے درمیان واؤ لکھنا بڑی غلطی ہے۔

❀❀❀

میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

Apr 2021
Vol.70

Regd. CPL No.115
No.4

Monthly **Meesaq** Lahore

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت وتعارف اور حقوق ومطالبات جیسے علمی وعملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفیٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور سیرت نبویؐ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب کے مراحل ومدارج اور لوازم

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

مجلد 500 روپے، غیر مجلد 300 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی اہمیت وفرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سُورۃُ الحَدید

(اُمُّ المُسبِّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبوی طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501(042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org